رسالہء معرفتِ نفس

تصنیف

ڈاکٹر سید حیدر رضا

ادارہ جویانِ حق

The Truth Seekers Foundation

Melbourne. Australia

یہ کتاب کیوں لکھی؟

معرفتِ نفس کے موضوع پر ایک کتاب کے لکھے جانے کی کیا ضرورت ہے اور مجھ حقیر نے اِس بظاہر دقیق موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کیسے کر لی؟ خاصے غور طلب سوالات ہیں۔ زندگی کو انسان مختلف نظریات کے تحت دیکھتے اور گذارتے ہیں، ان لوگوں کا یہاں ذکر نہیں ہے جن کی نظر میں زندگی کی اصل قدر غذائی لذات، شہوات پر مبنی تفریحات اور جسمانی آسائشوں کے حصول کا نام ہے۔ زندگی کی معنویت اور حقیقت پر غور کرنے والے انسانوں میں سے چند افراد کے لئے سب سے زیادہ جاذب اور خوشگوار پہلو ''زندگی کی پُراسراریت'' (Mystery of Life) ہے۔ جب وہ زندگی کی گہرائیوں میں اترنے کی سعی کرتے ہیں تو جس حقیقت کو اپنے روبرو پاتے ہیں وہ یہ کہ زندگی ہر پہلو سے اور ہر قدم پر حاملِ اسرار ہے اور پھر اُسی مقام سے اُبھرتی ہوئی صدا جہاں زندگی خود ہی فکر کرنے والے ذہن کو دعوت دیتی ہے کہ میرا کھوج لگاؤ اور میرے باطن میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔ یعنی زندگی نہ اتنی سادہ ہے کہ فوری اور کاملاً دَرْک ہو جائے اور نہ اتنی پیچیدہ اور obscure کہ اپنے اندر داخل ہونے والے کے تجسس کو دھتکار دے۔ یہی وہ حُسنِ نقشِ حیات ہے جس نے ہر دور میں کچھ انسانوں کو مبہوت و مجذوب بنایا ہے۔

اسرارِ حیات میں سب سے دلکش بلکہ روحانی اعتبار سے پُر لذت ترین جستجو خود اپنی ذات کی حقیقت کا کھوج لگانا ہے۔ اصطلاح میں اسی تحقیق کو حصولِ معرفتِ نفسِ انسان کہیں گے۔ یہ ایک ایسی کاوش ہے جو شاید اُس لمحے سے جاری ہے جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا تھا اور اس ساعت تک جاری رہے گی جب تک اِس دنیا کی زندگی مرحلۂ اختتام، یعنی یوم تُبْلَی السَّرَائِر تک نہیں پہونچ جاتی۔ انسان کا نفس یا اُس کی ذات کی حقیقت کسی بھول بھلیوں یا پُر پیچ وادی کی مانند نہیں ہے کہ کھوج لگاتے لگاتے جس کا نقشہ بالآخر گرفت میں آ ہی جائے گا بلکہ یہ ایک ایسا

کثیر الجہات اور منزل بالائے منزل وجود ہے [Multi-storeyed complex] کہ جب بندہ ایک جہت کی معرفت حاصل کر کے، خستہ حال ہو کر ستانے کے لئے بیٹھتا ہے تو فوراً ہی خبر آ جاتی ہے کہ یہ تو صرف ایک منزل کا سراغ ہاتھ لگا ہے نہ معلوم مزید کتنے طبقات بالائے سَر اور ہیں۔ جی ہاں! اسی لئے یہ راہ فقط دیوانوں کی لئے کھلی ہے۔ وہ سارے ہوشمند جو اپنی فکری قوتوں پر اس سے زیادہ زور نہیں ڈالنا چاہتے کہ اُن کے کھانے پینے، گھر اور گاڑی اور اولاد کی دنیوی تعلیم کے مسائل بخوبی حل ہو جائیں، ایسی راہوں پر چلنے کو وقت کا ضیاع جانتے ہیں۔ میں نے آپ کو ابتدا میں ہی خبردار کر دیا ہے تا کہ بعد میں آپ افسوس نہ کریں کہ میرا وقت ضائع ہو گیا۔

میں نے اِس موضوع کو ایک کتابی صورت میں تحریر کرنا کیوں پسند کیا؟ دو وجوہات؛ پہلی ذاتی اور دوسری اجتماعی۔ اگر اِن دونوں کو ذمہ داری کا احساس کہہ لیا جائے تو بھی غلط نہیں ہوگا۔ اولاً اپنی ذات میں موجود یہ یقین کہ اگر میں نے فقط مقلد ہو کر زندگی کی راہ کو طے کیا تو انجامِ حیات میں میرا درجہ پست اور ناقابل تعریف ہوگا۔ امام صادقؑ کے قولِ بیّن کے مطابق آخرت میں مومن کی جنت کا معیار اُس کی عقل یعنی معرفتِ حق کے معیار پر مبنی ہوگا۔ جب عقلِ رسا معیار ٹھہری تو ساتھ ہی اِس بارے میں بھی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ جس عقل کو اُدھار لے کر گذارا کیا جائے وہ میرے ساتھ یومِ قیامت تک نہیں چل پائے گی۔ پس میرے لئے لازمی قرار پایا کہ فطرتِ عقل (Original Wisdom) کے حصول کی خاطر سب سے پہلے ہادیانِ برحق کی تلاش کروں اور پھر زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو ان کی رہنمائی میں اپنے غور و فکر سے سمجھنے کی سعی کروں، تا کہ حقیقت کا نور میری ذات میں جذب ہو سکے۔

دوسری بنیادی وجہ، اس کام کی یہ بنی کہ جو مسائلِ معرفتِ مجھے درپیش ہیں کیا اوروں کے لئے بھی دشواری کا سبب نہیں ہوں گے؟ تو اگر اللہ مجھے ہدایت نصیب فرما رہا ہے تو میں بطورِ شکرانہ دوستوں اور عزیزوں کو بھی معرفتِ حق کی عظیم نعمت میں کیوں نہ شریک کروں۔ میرے لئے میری زندگی ایک بے چینی اور اُلجھن کا نام ہے جب تک مجھے خود اپنا آپ نہ سمجھ میں آئے۔ میرے لئے اس یقین کا پیدا کر لینا قطعاً دشوار نہیں ہے کہ دنیائے مادّی میں بسر کی جانے والی جسمانی زندگی نہ صرف ظاہری تکالیف سے بھرپور ہے بلکہ جذباتی اعتبار سے بھی اذیت رساں ہے، جب کہ دوسری جانب عقلی اور ایمانی پہلو کا انسان کی ذات کو بلند کرنا اور شخصیت میں نکھار پیدا کرنا بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ لیکن زندگی میں پائے جانے والے ان واضح Paradoxes کی موجودگی میں میرا فیصلہ کیا ہونا چاہئے؟ مجھے اپنا رُخ کس جانب کرنا چاہئے، عقل اور دین کی سمت یا دنیوی آسائشات کو باقی سب پر مقدم رکھوں؟ بظاہر جواب بہت آسان؛ لیکن عملی زندگی میں یہ فیصلہ انگارہ کو ہاتھ میں لینے کی مانند مشکل کیوں بن جاتا ہے؟ میری سمجھ کے مطابق؛ اس لئے کہ عمومی طور سے عقل کی راہوں کو طے کرنے والے [Scientists and Intellectuals] اور دین کا نام لینے والے، بلکہ تبلیغ کرنے والے بھی زیادہ تر دنیا دار ہیں اور محض ثقافت و سیاست، دنیوی تعلقات کی استواری اور معاشرتی رسومات پر زور رکھتے ہیں۔ ایسا دین جو زندگی اور اللہ کو محور بنا کر انسان کی عملی تربیت کو اپنا نصب العین قرار دے، عنقا کی مانند کمیاب ہے۔ لہٰذا راہِ حل کے واسطے آخری نتیجہ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں نکلتا کہ اپنی حقیقت پر از سرِ نو غور کیا جائے اور خود اپنے آپ کو اپنے پیدا کرنے والے کے کلمات کی راہ سے سمجھا جائے۔ اپنی معرفت ایک ایسا چراغ ہے جو نہ صرف کائنات بلکہ رَبّ کی معرفت کا نور عطا کرتا ہے۔ اپنی حقیقت سے غافل رہ کر ہدایت کا حصول ناممکن ہے۔

جب بصیرت ہدایت کے نور سے روشن ہو جائے گی اور جہالت کی دھول، فکر کے پیکر سے دھل جائے گی تب ہی باذن اللہ و بمشیۃ اللہ؛ امید قائم ہوگی کہ عمل بھی ''دینِ قیم'' کی سمت اور جہت پر ثابت اور استوار ہو جائے ورنہ عمل کے نام پر حرکت تو بہت ہے لیکن نتیجہ سوائے شیطانی ایجنٹوں کے، اور کسی کے ہاتھ نہیں لگتا۔ **والسلام**

پیش لفظ

جب میں نے سوچا، جب میں نے چاہا کہ اُسے حاصل کرلوں، اُس کے قریب ہوجاؤں جو ہر شئے کی حقیقت ہے اور مطلق سچائی ہے، تو اُس نے کہا کہ مجھے اگر پانا ہے تو اپنے اندر نظر کرو، اپنی حقیقت کو پہچانو، خود اپنے عارف بن جاؤ۔ میں تم سے کبھی بھی اور کہیں بھی جدا اور الگ نہیں ہوں۔ تمہاری ذات کا آئینہ میرے جلوؤں کو آشکار کرنے والا ہے اور تمہارے وجود کا سمندر اپنی تہوں (Layers) میں میرے اسماء وصفات کے گوہر ہائے گراں مایہ سمیٹے ہوئے ہے۔ اے کاش تم خود اپنے اندر غوطہ زن ہونے کی ہمت کرتے، تو اس سچائی سے ہرگز غافل نہ رہتے جس نے ہر طرف سے تمہیں گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے سمندر کے پانی نے تمام آبی مخلوقات کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ پس عزیزو! یہی وہ اٹل حقیقت اور کائناتی صداقت ہے جس کو ان ہستیوں نے جو حاملِ اسرارِ الٰہیہ اور ترجمانِ وحی ہیں، ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ: "**مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ.**" جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کرلی، پس بے شک اُس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کرلی۔

ان تمام شوق دلانے والے بیانات کے باوجود عجیب ترین بات یہ ہے کہ وہ انسان جو اسرارِ فطرت اور حکمت ہائے قدرت کو مسخر کرنے کے لیے چاند اور ستاروں، سیاروں پر کمند ڈال رہا ہے، وہ خود اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر، غافل اور محروم ہے۔ یعنی انسان کا اپنا آپ ہی اُس کے لیے "مجہول" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر تسخیرِ کائنات اور گوناگوں ایجادات کے باوجود انسان سکون کا متلاشی ہے۔ مادّیات کی چکاچوند میں انسان اس بنیادی نکتے کو فراموش کر بیٹھا ہے کہ بیرونی اور خارجی عالم کی نعمتیں اُس وقت تک رحمتوں اور برکتوں میں نہیں بدلتیں جب تک انسان کا اندرونی اور نفس کا جہان اللہ کے نور سے روشن نہیں ہوجاتا۔

جن کیفیات اور احساسات کا ہم نے تذکرہ کیا، جب انسان انہیں اپنے وجود کے اندر چٹکیاں لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور قولِ معصومؑ کی ہدایت کے مطابق معرفتِ نفس کے سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کرتا ہے، تو اُس کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ درپیش ہوتی ہے کہ نفس کی حقیقت کو کیوں کر پہچانا جائے؟ مسائلِ نفس کی شناخت کیسے ہو؟ نفس کی تربیت کے لیے کون کون سے اقدامات مفید ہیں؟ اور کون کون سے افعال، اعمال وافکار نفس کے لیے ضرر رساں ہیں؟ وغیرہ۔

لیکن یقین کریں کہ انسان کے لیے ساری دنیا کا پہچاننا اتنا مشکل کام نہیں جتنا دشوار خود اپنے آپ کو پہچان لینا اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی ایسا عالم، مفکر اور فلسفی سامنے نہیں آیا جو یہ دعویٰ کرسکتا ہو کہ میں نے وجودِ انسانی کی حقیقت کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے اور دوسروں کے لیے بیان کردیا ہے۔ اور ہم بھی جب اس سفر پر آگے بڑھ رہے ہیں، تو ہمہ یںم اور ہمہ دانم کے دعویٰ کے ساتھ نہیں بلکہ "افلا تعقلون اور افلا تتفکرون" کی صداؤں کا جواب دیتے ہوئے ایک ادنیٰ طالبعلم کی حیثیت سے اور بارگاہِ حقیقت میں ادب کے ساتھ سر کو جھکائے ہوئے۔

جب ہم اُس راہ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں جسے عقل وحکمت کی رہنمائی کے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا، اور اُن موضوعات کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں (فطرت، نفس اور روح وغیرہ) جنہیں حواسِ خمسہ کے ذریعہ دیکھا اور چھوا نہیں جاسکتا، تو ہمارے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ اُن منابع کی طرف رجوع کریں جو عالَمِ غیب کے احوال پر مطلّع ہیں اور جن کی رہنمائی کے بغیر ماوراء مادّہ عالم کی کسی جہت کو نہیں سمجھا سکتا۔ یعنی کلامِ وحی اور تحقیق شدہ اقوالِ معصوم۔ یہاں یہ بات واضح ہوجانا اشد ضروری ہے کہ ہمارا وحی کی رہنمائی کی طرف رجوع کرنا ایک علمی ضرورت بلکہ احتیاج ہے اس کا تعلق مذہبی یا مسلکی جانبداری سے بالکل بھی نہیں ہے کیونکہ دیانتدارانہ جستجو طالبعلم پر روشن کر دیتی ہے کہ انسانی عقل کی جولانیاں ایک طرف اور "**علّم الانسان ما لم یعلم**" کی بلندی اور رسائی ایک جانب۔ دونوں کسی بھی لحاظ اور رتبہ میں لایقِ مقائسہ نہیں ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جو ثابت اور ناقابلِ تردید ہے لیکن عوام اس سے بے خبر اور عالمانِ خود پرست اس کے منکر ہیں۔ **وھو الھادی و ماعلینا الّا البلاغ.**

قارئین سے اہم گذارشات

کتاب شروع کرنے سے پہلے ہی میں نے آپ کے اذہان کے لئے کافی مواد پیش کر دیا ہے تو اب صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ برائے مہربانی آنے والے ابواب میں پیش کردہ عنوانات اور ذیل میں قائم کئے گئے استدلالات کو کھلے ذہن سے غور کرنے اور سمجھنے کی کوشش فرمائیں۔ علمی موضوعات میں اہم ترین تقاضا ایک کھلا ہوا ذہن ہوتا ہے جو کورا کاغذ نہ ہو لیکن اپنی موجودہ فکر اور پہلے سے قائم شدہ نظریات سے آگے بھی مطالب پر غور کرنے اور انہیں قبول کرنے کی اہلیت رکھتا ہو، بالخصوص اگر مضبوط دلائل بھی فراہم کر دئے جائیں۔

دوسری اہم بات یہ کہ آنے والے صفحات میں بیان کردہ مطالب اُن حضرات کو خصوصیت سے مد نظر رکھتے ہوئے تحریر کئے گئے ہیں جو قرآن سے باخبر ہیں اور جن کو ہر لفظ کا جداگانہ حوالہ دینے اور معنی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ کہ پوری کوشش کی گئی ہے کہ اِس حوالے سے قارئین کرام پر زیادہ دباؤ نہ ڈالا جائے لیکن مودبانہ گذارش ہے کہ بیان کی گئی ہر آیت کا بغور ترجمہ، سیاق وسباق کے ہمراہ ضرور ملاحظہ کیا جائے۔

آخری گذارش یہ کہ یہ کتاب ایک طالبعلم کی حیثیت سے لکھی گئی ہے نہ کہ فقیہ اور مجتہد کے قلم سے ظہور میں آئی ہے لہذا نہ صرف میرے علم ومعرفت میں اضافہ کے لئے دعا فرمائیں بلکہ اپنی قیمتی رائے سے بھی ضرور نوازیں۔ تنقید مجھے ہرگز بری نہیں لگے گی۔ بالخصوص اگر آپ کو یہ احساس ہو کہ آپ کی معرفت میں کچھ اضافہ ہوا ہے تو میرے اور میرے اہلِ خانہ کے لئے خصوصی عنایاتِ الٰہی کے نزول کی دعا فرمائیں۔

تشکر وانتساب

میں ذاتی طور پر ممنون اور شکر گذار ہوں اُن علما کا جو راہِ حق کے نہ صرف مسافر بلکہ راہنما بھی ہیں۔ وہ حضرات جن کے وسیلہ سے اللہ نے دین و قرآن کی معرفت عطا فرمائی علی الخصوص علامہ محمد حسین طباطبائی اور آیۃ اللہ جوادی آملی رضوان اللہ علیھما، جن کی بلندی درجات کے لئے مسلسل دعا گو رہتا ہوں۔ اس کے علاوہ ابتدائے ایام حیات میں مولانا آغا جعفر نقوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ سے جو معرفت عطا ہوئی تو اُن کا ہمہ وقت شکریہ بھی میری زندگی کے ساتھ ہے۔ ان ہی ہستیوں کے نام میں اپنی اس کوششِ قلم کو منسوب کرتا ہوں۔ اللہ اپنے اولیاء کا سایہ کبھی ہمارے سروں سے نہ ہٹنے دے۔

بابِ اوّل

تعارف اور ابتدائیہ

کیونکہ ہمارا موضوع اور اس کے ذیل میں برپا ہونے والے مباحث بذاتِ خود نازک اور دقیق ہیں اور قارئین سے کامل توجہ اور باریک بینی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں' لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ میدانِ مباحث میں وارد ہونے سے قبل مضامین کو اچھے طریقے سے متعارف کرادیا جائے تاکہ آنے والے صفحات میں گفتگو کا تنوع اور پھیلاؤ ذہنی تھکن اور فکری تناؤ کا باعث نہ بن جائے۔

والله المستعان.

جیسا کہ واضح ہو چکا ہمارا موضوعِ اساسی ''معرفتِ نفسِ انسان'' ہے۔لیکن پہلا سوال یہ کہ نفس کی تعریف کیا ہے؟ اور اگر نفس، انسانی ہو تو کیا اس میں کچھ نئی اور اضافی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں؟ جس کا سادہ مگر جامع جواب یہ ہوگا کہ نفس کا مطلب کسی بھی شے یا ہستی کا اصلِ وجود ہے اور اگر انسان کے حوالے سے نفس کا لفظ استعمال کیا جائے تو مطلب ہوگا 'انسان کی وجودی حقیقت' یا 'اُس کی' مَیں (Me or myself)'۔انسانی نفس ایک ایسی حقیقت ہے جو بیک وقت جسمانیات اور روحانیات، یا مادّے اور ماوراء مادّہ، سے وابستہ ہے لہٰذا جب تک ذہن دونوں مقامات میں موجود معارف تک رسائی نہ رکھتا ہو اُس وقت تک نفسِ انسانی کی درست معرفت حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔جسمانیات وہ مقام ہے جہاں نفس کے آثار بصورتِ ارادہ و افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔اس مقام کا دقیق مطالعہ نفسِ انسانی کے بارے میں اُٹھنے والے بہت سارے سوالات کے جوابات کو روشن کر دیتا ہے لیکن یہ موضوع ہماری موجودہ بحث کے نصاب سے خارج ہے۔ہمارا مطمحِ نظر نفس کی حقیقت کو قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کرنے کے ساتھ اُس کی وجودیت کو دو حوالوں سے اجاگر کرنا ہے۔پہلا یہ کہ نفسِ انسانی اُن تمام صفات کے لئے جو جسم کے ذریعہ سے ظہور میں آتی ہیں رہنمائی کہاں سے حاصل کرتا ہے یعنی نفس کے پاس انسانی (نہ کہ نباتی اور حیوانی) زندگی کا شعور کہاں سے آتا ہے؟ دوسرا اہم حوالہ یہ کہ نفسِ انسانی کے ارتقاء کی راہ کیا ہے اور اُس کی پہونچ کہاں تک ہے؟ اگر ان دونوں سوالوں کو آسان الفاظ میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ نفس بذاتِ خود کس بنیاد (Foundation) پر قائم اور استوار ہے اور اسے بلند کرنے والی شے کونسی ہے۔دیگر یہ کہ اس ارتقائی سفر میں سیرِ نفسانی کا میدان کیا ہے، ترقی کی راہیں کونسی ہیں اور بلند ہونے کی آخری حد کیا ہے؟ کیا نفس کے لئے صرف ترقی ہے یا تنزلی اور سقوط کے خطرات بھی برابر سے موجود ہیں؟ تحقیق کے مرحلہ اولیٰ کو طے کرنے کے لئے ہمیں ''فطرت'' کے معنی کو سمجھنا پڑے گا اور دوسرے سوال کی وضاحت روح اور علم اسمائے الٰہیہ کے بارے میں غور و فکر سے فراہم ہو سکے گی۔

پس موضوعِ معرفتِ نفس تک پہنچنے سے قبل جس حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے وہ ''فطرتِ انسانی'' ہے کیونکہ نفس خلا میں معلق نہیں بلکہ انسان کے نفس کی بنیاد فطرت پر استوار ہے۔فطرت کے معنی کو سمجھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ نفس کا بنیادی ساختمان اور ڈھانچہ اچھے طریقے سے سمجھ میں آجائے گا اور نفس کے ارتقا اور سقوط کے امکانات بھی بیّن اور روشن ہو جائیں گے۔ فطرت کو سمجھنے کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوگا کہ ہم پر یہ امر واضح ہونا شروع ہو جائے گا کہ نفس کی حقیقت کیا ہے اور خالقِ نفس نے پیغامِ وحی کے ذریعہ سے (قرآنی آیات میں) نفسِ انسانی کو کن امور اور معاملات کا مسئول و ذمے دار قرار دیا ہے' اور کن مقامات کی جانب پیش قدمی کی دعوت دی ہے۔حقیقتِ نفس کو سمجھنے میں انسانِ اوّل یعنی حضرت آدمؑ کی خلقت کے حوالے سے

چند نکات بھی بہت مفید ہیں، لہٰذا اُن کا تذکرہ بھی ہماری رہنمائی کے لیے شاملِ حال رہے گا۔

نفس کی معرفت حاصل کرنے میں ہم ''روح'' کے تذکرے کو کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ روح ہی وہ حقیقت اور قوت ہے جو نفس کو بالاتر عوالم کی جانب متوجہ کرتی ہے، حقائق ملکوتی سے آشنا کراتی ہے اور اسے وہ توانائی فراہم کرتی ہے کہ نفس مادّیت کی قید سے آزاد ہو کر فضائے ملکوتی میں پرواز کے قابل ہو سکے۔ اگرچہ روح کے ساتھ ساتھ نفس کا مسلسل رابطہ جسمِ مادّی سے بھی ہے، بلکہ جسم وہ قالب اور ظرف ہے جس میں نفس رہائش پذیر ہے لیکن کیونکہ ہمارا بنیادی مقصد ارتقائے نفس کی خاطر معرفتِ نفس کا حصول ہے، لہٰذا ہم جسم کا تذکرہ صرف اس عنوان سے کریں گے جو ہمارے اصل مقصد سے مربوط اور ہم آہنگ ہو۔

یہ حقیقت ہر شبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام صرف تعمیرِ نظریہ، تفکر اور تعقل کا حامی نہیں، بلکہ عملِ صالح کو بھی اساسی اہمیت عطا کرتا ہے، لہٰذا قرآن اور اہلِ بیتؑ کی تعلیمات کے مطابق کوئی بحث محض فکری اور نظریاتی مقامات کو طے کر کے مکمل نہیں ہوتی، جب تک کہ اس کے ''استعمال'' کو بھی واضح نہ کر دیا جائے۔ اسی بنیادی قانون کی رو سے ہم دورانِ تحریر متعدد سفارشات ''تربیتِ نفس'' کے حوالے سے بھی ہدیۂ خدمت کرتے رہیں گے، تاکہ ہمارے قارئین معرفتِ نفس کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنے نفوس کی عملی ترقی کے لیے بھی اقدامات کر سکیں۔ **والمعاقب لِلّٰہ.**

بابِ دوّم
فطرت اور ہدایتِ فطری

ہم فطرت کا مطلب کسی بھی شخص کے رجحانات اور عادات و اطوار کو سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اگر کوئی دھوکا باز انسان ہمیں نظر آتا ہے، تو ہم اس کے بارے میں رائے صادر کرتے ہیں کہ ''اس کی تو فطرت ہی خراب ہے''۔ لیکن اگر ہم کلام الٰہی اور اقوالِ معصومینؑ کے مطابق فطرت کو سمجھنے کی کوشش کریں، تو اس لفظ کے ایک جداگانہ اور عمیق معنی سامنے آتے ہیں جن کی مدد سے حقیقتِ وجودِ انسان اور حقیقتِ نفس کو درک کرنے میں بہت مدد حاصل ہوتی ہے۔

فطرت کی تعریف اور اس کی خصوصیات کے حوالے سے قرآنِ مجید کا واضح بیان سورۂ روم کی آیت نمبر تیس (۳۰) میں سامنے آتا ہے۔ اس آیت کی سب سے خصوصی اہمیت یہ ہے کہ 'فطرتِ الٰہی اور اس کی بنیاد پر فطرتِ انسانی' کا نظریہ قرآن کریم میں صرف اس ایک آیت میں بیان ہوا ہے۔ متن آیت یہ ہے:

''**فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا.**'' (۳۰ : ۳۰)

ترجمہ: پس قائم کر لو اپنے وَجْہ کو دین کے لئے حالتِ اعتدال کے ساتھ. اللہ کی فطرت وہ ہے جس پر انسانوں کی فطرت کو قائم کیا گیا ہے.

یہ آیت جسے آیۃ فطرت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، تقاضا کرتی ہے کہ اِس کے ایک ایک لفظ پر اچھی طرح سے غور و فکر کیا جائے لیکن اُس کے ساتھ ہی قواعدِ تفسیر کے مطابق یہ امر بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہئے کہ کسی آیت کے بیان کا درست فہم حاصل کرنے کے لئے ماقبل کی آیتوں کا بھی بغور مطالعہ کیا جانا ضروری ہے تاکہ آیت کا پس منظر یا context اچھے طریقہ سے

واضح ہوجائے۔ یہ آیت جن آیتوں کے ربط اور تواتر میں بیان کی گئی ہے اُن میں تفصیل کے ساتھ اللہ کی صفات اور آسمان و زمین میں پھیلی ہوئی الٰہی نشانیوں کے ہمراہ انسانی زندگی کی اہم ترین جہات کا ذکر بھی موجود ہے۔تو شاید یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو کہ فطرت صرف انسان ہی نہیں بلکہ مجموعی نظامِ خلقت کی اصل اور بنیاد ہے اور انسان کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا گیا کہ انسان خلاصہ کائنات ہے۔ علامہ طباطبائیؒ نے تفسیرِ عظیم الشان ''المیزان'' میں سورۂ روم کی آیت ۳۰ کے ذیل میں چند اساسی مطالب بیان فرمائے ہیں جن سے استفادہ کرتے ہوئے ہم مذکورہ آیت کے الفاظ کو علیحدہ اور جدا کر کے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں' تا کہ قرآن کی نظر میں فطرت کا مطلب واضح ہو سکے۔حسب ذیل نکات لائقِ توجہ ہیں:

۱)**فَاَقِمْ**: ترجمہ؛ پس قائم کرلو۔ابتدائے آیت میں حرف ''فاء'' ہمیں اس نتیجے تک پہنچا رہا ہے کہ اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ آیاتِ ماقبل کا فرع اور نتیجہ ہے۔یعنی کیونکہ اللہ انسانوں کا اور تمام کائنات کا خالق ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ تمام امور کی تدبیر بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے اور ان دونوں حقائق سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمام مخلوقات کے آغاز و انجام کا مالک ہے اور ان تمام معاملات میں ''وحدہ لاشریک'' بھی ہے۔ پس تقاضائے عقل یہ ہے کہ ''وہ ہستی جو خلقت' تدبیر اور مبدء و معاد کی بلاشرکتِ غیرے مالک ہے' وہی حقدار ہے کہ انسان صرف اور صرف اُسی کی راہ اور جہت پر خود کو قائم و استوار کرلے۔''

۲)**وَجْهَكَ**: ترجمہ؛ اپنے وجہ کو۔ لفظ ''وجہ'' سے دو معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ایک 'جہت اور سمت' اور دوسرا 'چہرہ'۔لہٰذا "**وَجْهَكَ**" کا مطلب ہے تمہاری جہت یا تمہارا چہرہ۔ یہاں پر "**وجہ**" بمعنی 'چہرہ' بھی لائق توجہ ہے' کیونکہ جس طرف انسان کے چہرے کا رُخ ہوتا ہے وہی رُخ انسان کی سمت اور جہت کا بھی تعین کرتا ہے۔

۳)**حَنِيْفًا**: اس کا مطلب ہے کہ اپنے قدم کو استوار رکھتے ہوئے وسطِ راہ پر چلنا اور یہاں اس لفظ سے منظور حالتِ اعتدال ہے۔وسطِ راہ یعنی افراط و تفریط سے محفوظ راستہ۔

لہٰذا **فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا**. کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنی توجہات اور جہتِ وجود کو دین خدا کے رخ اور راہ پر قائم رکھو۔دین اللہ کی تعلیم کردہ سنّتوں کا مجموعہ جس پر عمل سعادتِ ابدی کا ضامن ہے۔ قائم رہنے کی شرط یہ کہ انسان عدالت پر باقی ہو اور افراط و تفریط سے پاک رہے۔

۴)**فِطْرَت**: فطرت کسی نوع کی بِنَا یا بنیاد کو کہتے ہیں اور زیرِ نظر آیت میں فطرت سے مراد خلقتِ انسان کی بنیاد ہے۔ بر بنائے دلیلِ عقلی یہ بنیاد کسی ایسی ہستی کی مرہونِ منت ہوگی جو خود انسان نہیں ہو۔کیونکہ کوئی شے خود اپنے وجود اور خلقت کی بنیاد نہیں قائم کرسکتی۔

(۵)**فِطْرَتَ اللهِ** :لفظی ترجمہ ہے اللہ کی فطرت لیکن اس سے مراد وہ بنیاد ہے جسے خود اللہ نے قائم کیا ہے۔ اس فقرے میں وضاحت کر دی گئی کہ بنیاد کا قائم کرنے والا اللہ ہے اور اس قیام میں انسان کی کوئی شرکت نہیں ہے۔کیونکہ اِس بنیاد کے قیام میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے لہٰذا فطرت کی نسبت اللہ نے اپنے آپ سے دی ہے۔ یہ نسبتِ ذاتی فطرتِ انسانی کی کرامت و عظمت کی بھی دلیل ہے جیسا کہ شرافتِ روحِ انسانی کو واضح کرنے کے لئے فرمایا **روحی**۔

۶) **فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا**: ترجمہ؛ بنیاد بنائی تمام انسانوں کی جس (بنیاد) پر۔پس روشن ہوا کہ تمام انسانوں کی فطرت یعنی خلقت بلکہ ماہیتِ وجود کی بنیاد 'فطرت اللہ' یعنی اللہ کی قائم کردہ بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ یہاں پر لفظ ''الناس'' خاص طور سے قابلِ غور ہے' جو واضح کر رہا ہے کہ تمام انسان بلاتفریق رنگ' نسل اور مذہب اور بلا امتیاز مومن' مشرک اور منافق فطرت کی نعمت سے بہرہ مند

ہیں اوراپنے وجود کی گہرائیوں میں اپنے 'فاطر' کا شعور رکھتے ہیں۔واضح اور روشن رہنا چاہیے کہ فاطر، خالق کو نہیں کہتے بلکہ فاطر وہ ہستی ہے جو کسی بھی شے کی اصل کو وجود میں لانے والا اور اُس کی بنیادی حقیقت کو پیدا کرنے والا ہو جبکہ خالق وہ ہوتا ہے جو بنیاد پر عمارت بنائے، شکل وصورت کو ارتقاء دے اور خام مادّے کو مفید مواد میں تبدیل کردے۔ اب ہم بیان کردہ تفسیری ارشادات کو مزید اجاگر کرنے کے لئے بحث کو چند سوالات کے ذریعہ سے آگے بڑھاتے ہیں۔

بحث ومطالب

۱۔فطرت حقیقتاً کیا ہے؟

جواب: فطرت وہ بنیادی اور اساسی بناء انسانیت (Basic Foundation) ہے جو تمام انسانوں کی سرشت میں پنہاں ہے۔جس طرح پروردگارِ عالمین نے سورۂ والشّمس (۹۱) میں گیارہ قسمیں کھانے کے بعد نفسِ انسان کی کیفیت کو بیّن وروشن فرمایا ہے، اِسی انداز سے سورۂ والتّین میں چار قسمیں کھانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ: ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ'' (سورہ تین ۹۵۔آیت ۴) **ترجمہ: بے شک ہم نے خلق کیا انسان کو بہترین قوام میں** . یعنی انسان کی خلقت کا اصل فارمولا اور بنیاد 'احسن' یا بے حد حسین ہے۔اس آیت میں استعمال ہونے والا لفظ ''قــــوام'' اس شئے، وضع یا شرط کو بیان کرتا ہے جو انسان کے وجود کے ثبات، ارتقاء اور بقا کے لیے لازمی وضروری ہو۔پس انسان کے وجود کی بنا نہایت حسین ہے جس پر خلقت کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔یہ احسنِ تقویم وہی 'فطرت اللہ' ہے جس پر تمام انسانوں کی فطرت تشکیل دی گئی ہے۔پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث ''کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلیٰ فطرة الاسلام.'' بھی اِسی اساسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ ہر پیدا ہونے والا نفس فطرت اِسلام یعنی فطرت اللہ پر پیدا ہوتا ہے، تا اینکہ اُس کا ماحول اور اُس کے پرورش کنندگان اُسے کسی دوسرے راستے پر (جو فطرت سے منحرف ہو) چلنے کے لیے آمادہ اور راغب کرلیں۔

۲۔ فطرت کی موجودگی کا اصل فائدہ کیا ہے؟

جواب: فطرت صرف اُس بنیاد کا نام نہیں ہے جو ہر انسان کو پیدائش کے ساتھ عطا کی گئی ہے اور جس پر انسان کے وجود اور شخصیت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے، بلکہ فطرت اپنے ہمراہ اُس ہدایت کو بھی لے کر آتی ہے جس کی وجہ سے ہر انسان اپنی زندگی میں کسی اِلہٰ اور معبود کو تلاش کرتا ہے اور جس کے وسیلے سے انسان اپنی حیات میں صحیح کو غلط اور حق کو باطل سے جدا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کئی مقامات پر اِس ہدایتِ فطری کا برملا تذکرہ فرمایا ہے، کہ یہ وہ ہدایت ہے جو نہ صرف انسان بلکہ ہر مخلوق کو اُس وقت سے حاصل ہے جس لمحہ میں وہ معرضِ وجود میں آیا یا آئی تھی۔مثال کے طور پر دو آیتوں کو ملاحظہ فرمائیں۔پہلی آیت میں حضرت موسیٰؑ ، فرعون کو بنیادی توحید سمجھاتے ہوئے بیان فرما رہے ہیں کہ: 'رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی.'' (سورۂ طہٰ ۲۰۔آیت ۵۰) **ترجمہ: ہمارا رب وہ ہے جس نے تمام اشیاء کو خلقت عطا فرمائی اور پھر اُن کی ہدایت کی** . اور دوسری آیت میں اللہ خود تخلیق کے بنیادی ڈھانچے کو ان الفاظ میں بیان فرما رہا ہے: '' الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی .'' (سورۂ اعلیٰ ۸۷۔آیات ۲ اور ۳)۔**ترجمہ: (اللہ) وہ ہے جس نے خلق کیا، تو پھر اُس کو درست (معتدل اور balanced) فرمایا اور جب مقدّر کیا تو پھر ہدایت فرمائی**. انہیں آیات کی بنا پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ فطرت، فقط انسان تک محدود نہیں ہے بلکہ ہدایتِ فطری تمام مخلوقات کے واسطے موجود ہے۔

۳۔کیااللہ نےنفس کوفقط ہدایتِ فطری سے آراستہ کیا ہے؟

جواب: اللہ نےنفسِ انسانی کے واسطےایک محکم اور مستحکم بنیادقرار دی جس کا نام فطرت ہے۔ فطرت کے لئے ایک حسین ڈیزائن اور فارمولاتشکیل دیااور ارادۂ الٰہی یہ ہے کہ انسان کے وجود کی تعمیر اِسی ڈیزائن کے مطابق ہو۔کیونکہ انسانوں کی اکثریت ہدایتِ فطری سے بے خبر ہے لہٰذا اللہ نے صرف ہدایتِ فطری پر اکتفانہیں کیا' بلکہ انبیاءؑ رُسل اور کُتبُ ہائے آسمانی کے ذریعہ سے ناقابلِ تردید حقائق اور روشن نشانیاں بھی انسانوں کوعطا فرمائیں' تاکہ کسی انسان کوفطری ہدایت کے استعمال میں ابہام اور اشکال درپیش نہ ہو۔فطرت کی حفاظت اور ہدایتِ فطری سے کما حقہ استفادہ کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی جہتِ حیات کواللہ کی جہت پر قائم کرلے اور اِس 'اقامت' میں 'حنیف' رہے۔یعنی عدالت کواپنا شعار بنائے اور ہرقسم کی افراط وتفریط سے پاک رہے۔افراط کی مثال گناہ اور معصیت ہے جبکہ تفریط سستی اور بے عملی پرمبنی ہوتی ہے۔ہدایت فطری پر حنفیت کے ساتھ قائم رہنا وہ اسلوب اور روشِ حیات ہے جوانسان کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی عقلوں میں پوشیدہ خزائن اور دفینوں کونکالنے کے قابل ہو سکے اور اصلی حقیقی اور دائمی زندگی میں بیش بہااور باعظمت سرمایہ کوحاصل کر سکے۔

۴۔فطرت انسان کوکن امور پرآمادہ کرتی ہے؟

جواب: انسان کی فطرت ایک طرف اسے ہدایتِ تکوینی عطا کرتی ہے اور دوسری جانب ہدایتِ تشریعی کے لیے آمادہ اور مستعد بناتی ہے' ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ فطرتِ انسان ایک ایسے کمال کی بھی عاشق ہے جو ہرعیب اورنقص سے بری اور پاک ہو' جیسے حیات بدونِ ممات اور علم بغیر جہل وغیرہ۔سورۂ طٰہٰ کے آخر میں حضرت آدمؑ کے واقعہ کے چند پہلو مذکور ہیں' وہاں ایک جگہ ابلیس (جوآدم اور حوا کے سامنے پرخلوص نصیحت کرنے والوں کے بھیس میں ظاہر ہواتھا) یہ جملہ کہتا ہوانظرآتا ہے کہ:''هَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْکٍ لَّا یَبْلٰی ''جس کاترجمہ یہ ہے کہ:''کیا میں تمہاری رہنمائی نہ کروں ہمیشہ باقی رہنے والے درخت اور اُس مُلک کی جانب جس پر بلا (وزوال) نہ آئے۔''ابلیس کا پھینکا ہوا وسوسہ کا یہ تیرٹھیک نشانے پر جا کر بیٹھا کیونکہ یہ آدم کی فطرت کی پکارتھی۔جس فطرت پراللہ نے آدمؑ کی فطرت کوخلق فرمایا ہے اُس کی بنیادی تمنّا اُن نعمتوں کا حصول ہے جو ہمیشہ باقی رہیں اور ان میں جوتمنائیں سرِفہرست ہیں وہ ہیں دائمی اور تکالیف سے پاک زندگی اور ایسی ملکیّت جوکبھی ضائع اور زائل نہ ہو۔لہٰذااس بات کا دُہرانا عبث نہیں ہوگا کہ 'فطرت' کمالِ لامتناہی کی عاشق اور طلبگار ہے اور یہ جذبہ تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ہرانسان چاہے اُس کاتعلق کسی بھی خطۂ ارضی سے ہوخواہ وہ کسی مذہب اورنسل سے تعلّق رکھتا ہواُس کی بنیادی خواہش اُسی کمال کا حصول ہے جس کا تذکرہ ابھی ہم نے حضرت آدمؑ کے حوالے سے کیا۔یعنی تکلیفوں اور خرابیوں سے پاک زندگی اور بلا وزوال سے مبرّا ملکیّت ۔لیکن فرق انسانوں کی فہم وفراست میں واقع ہوتا ہے۔زیادہ تر انسان مادّی لذّتوں اور آسائشوں سے جنم لینے والے دھوکے اور فریب کو کمال سمجھ کر اُس کے حصول کے پیچھے زندگی گنوا دیتے ہیں اور تمام انسانیت میں تھوڑے سے انسان ہی ایسے نکلتے ہیں جوحق اور حقیقت کی معرفت رکھتے ہوئے اُس کمال تک پہنچ پاتے ہیں جولامتناہی ہواور واقعاً دارِسُرُور بھی ہو اور دارِخُلُود بھی۔

۵۔اگرانسانی فطرت اپنے اندرالٰہی حقائق رکھتی ہے تو کیا وہ اصول ضایع بھی ہو سکتے ہیں؟

جواب: فطرتِ انسانی کی یہ تین اصالتیں۔یعنی شعورِتوحید، حق اور باطل کا بنیادی تصور اور

کمالِ لامتناہی کا عشق، ہر انسان میں ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔فطرت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ہم نے سورۂ روم کی آیت ۳۰ کو بطور رہنما پیش کیا اور چند اساسی معروضات آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ اِسی آیت میں فطرت کی اصالت کو بیان کرنے کے بعد اللہ کا اعلان یہ ہے کہ ''(لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ) (ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ) (وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ) '' آیتِ کریمہ کا بیان تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی خلقت نا قابلِ تبدیل ہے۔ وہ بنیاد جسے خدا نے بعنوانِ فطرت قائم کیا ہے وہ نا قابلِ تغیر ہے۔ دوسرے جزو میں بیان ہوتا ہے کہ وہ دین حنیف جو اِسی فطرت سے ماخوذ و مربوط ہے، وہی قائم اور باقی رہنے والا ہے یعنی **دیـنِ قیّـم** وہ ہے جو نہ تبدیل ہونے والی خلقت سے مربوط ہے۔ اور آیت کا تیسرا حصہ اظہارِ افسوس ہے کہ زیادہ تر انسان فطرت کے جوہر کو اپنے وجود میں رکھنے کے باوجود اِس گوہرِ گراں مایہ سے استفادہ کرنے کے معاملے میں لاعلم ہیں۔ یہ لاعلمی دراصل غفلت اور بے توجّہی کے معنی میں ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ فطرت کی اصالتیں، کوتاہیِ فکر و عمل، اتباعِ ہوا و ہوس اور غلبۂ شہوات کے سبب سے گمراہ، مغلوب، مقہور اور مجبور ہو جاتی ہیں، اور انسان اُس راہ پر چلتا ہوا نظر آتا ہے جو خلافِ فطرت ہے۔ تو بلاشبہ انسانوں کی کثیر تعداد فطرت کے نور سے استفادہ کرنے سے قاصر اور معذور ہے جس کی وجہ اُن کی غفلت اور خلافِ حق امور کی چاہت ہے

۶۔ کیا فطرت کو مٹایا یا ختم کیا جانا ممکن ہے جیسے کہ جسمِ انسانی کو قتل کیا جا سکتا ہے؟

جواب: آیہ فطرت کے آخری حصہ کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ فطرت کے بارے میں اہم ترین اور نا قابلِ فرار حقیقت یہ ہے کہ ''فطرت کو کبھی قتل یا ختم نہیں کیا جا سکتا'' کیوں؟ اِس لیے کہ ربّ کا ارشاد ہے کہ ''**لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ** ۔لہٰذا یہ امر بلاشک واشتباہ ذہن میں راسخ رہے کہ وہ فطرت جس پر تمام انسانوں کے وجود کی عمارت تعمیر ہوتی ہے، وہ فطرت جو فطرتِ الٰہیہ سے ماخوذ ہے، نہ قتل کی جا سکتی ہے، نہ مسخ اور نہ منسوخ۔ بلکہ انسان اپنی فطرت کو مجبور، مغلوب اور مقہور بنا کر قید کر سکتا ہے، اُس پر پردے ڈال سکتا ہے۔ لیکن صرف اُس لمحے تک جب تک انسان اِس عالَمِ مادّیت میں اختیاری زندگی گزار رہا تھا۔ انتقال کے ساتھ ہی وہ عامل یا آمر جس نے فطرت کو شھوات اور ھوا و ہوس کے قید خانے میں مقید کر رکھا تھا برزخ کی فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے نتیجتاً فطرت اپنی اصل شکل اور حالت میں نمودار ہو جاتی ہے اور قبر کے اندر نفس، فطرت کے شفّاف آئینے میں اپنے قبیح اور مکروہ اعمال و کردار کو ملاحظہ کرتا ہے لیکن نجات کی کوئی سبیل اُس کے پاس نہیں ہوتی۔ پس انجامِ کار اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ احساسِ زیاں اور غفلت سے جنم لینے والی حسرت و ندامت نفس کے لیے حقیقی جہنم کو تشکیل دینے کا سبب بن جائے۔ یہاں اس امر پر پھر اچھی طرح غور فرمایئے کہ فطرتِ اصلی نہ قتل کی جا سکتی ہے نہ مسخ نہ منسوخ۔ بلکہ فطرت کو مجبور کر کے قید کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی صرف اس لمحے تک جب تک انسان دنیوی زندگی یا عالمِ تکلیف میں موجود ہے اور بااختیار ہے۔

اساسی نتائج کا اعادہ (Revision)

۱۔ نفسِ انسانی کی بنیاد فطرت ہے اور فطرت کی اساس شعورِ توحید ہے کیونکہ **فطرت الله التی فطر النّاسَ علیها.**

۲۔ دین کے احکامات دراصل انسان کی فطرت کی محافظت اور اسے پروان چڑھانے کے لیے نازل کیے گئے ہیں۔ یعنی اگر نفس کو اپنی بنیادیں محفوظ رکھنا ہیں، اگر اُن بنیادوں پر پائیدار اور عالیشان عمارت تعمیر کرنا ہے جو ہمیشہ باقی رہے تو دینِ حنیف کی راہ کو اپنانا پڑے گا۔ جب تک

انسان دین سے بے بہرہ رہتا ہے ہمیشہ ایسی جگہ پر کمال کو تلاش کرتا رہتا ہے جو فاقدِ کمال ہے۔ اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہوتی ہے جو صحرا میں پیاسا ہو اور مسلسل ایک سراب سے دوسرے سراب کی طرف بھاگتا رہے۔ اور یہ سرابات کیا ہیں؟ یہ ہیں مال و دولت، شہرت، حسنِ ظاہری، حصولِ مملکت و ریاست وغیرہ۔ سراب زدہ زندگی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے ہی انسان ایک طویل تگ ودو کے بعد اپنے مطلوب سے نزدیک ہوتا ہے، تو کچھ ہی وقفے کے بعد محبوب، مبغوض ہو جاتا ہے۔ جسے حاصل کیا تھا وہ حقیر معلوم ہونے لگتا ہے اور ایک نئے سراب کی طرف بھاگنے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ یونہی یہ عمر تمام ہو جاتی ہے اور نتیجہ وہی برآمد ہوتا ہے کہ قبر کی تنہائی میں، فطرت کے آئینہ میں نفس اپنے لئے اپنے ہاتھوں سے وجود میں آنے والی تباہی کا مشاہدہ کرتا رہے جیسا کہ ہم نے مطالب کے نکتہ نمبر ۶ میں بیان کیا۔

۳۔ انبیاؑ کی تعلیمات اور دینی ہدایت، ہدایتِ فطری سے جداگانہ کوئی حقیقت نہیں ہیں بلکہ اسے روشن اور اجاگر کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ انبیاءؑ کی دعوت، جس کا ہمارے لئے سرچشمہ قرآن کریم ہے، نفسِ انسانی کے لئے چند اساسی موضوعات کو بیّن اور روشن کرتی ہے تاکہ نفس ہدایتِ فطری سے کما حقہ مستفیض ہو سکے۔ وہ مضامین درجِ ذیل ہیں:

(i) تمام پیامبرانِ الٰہی کی دعوت کی بنیادِ اصلی توحید ہے یعنی کمالِ لامتناہی اور حسنِ دائمی جس کی فطرتِ انسانی محبّ بلکہ عاشق ہے۔ پس روشن رہے کہ ایسا کمال جس میں زوال نہ ہو، وہ زندگی جو فنا سے محفوظ ہو اور وہ خوشی جو دائمی اور سرور و بھجت سے لبریز ہو، صرف اور صرف سرچشمۂ حیات یعنی ذاتِ اقدس الٰہ میں ہی مل سکتی ہے۔ کیونکہ وہی ''حی و قیوم'' اور ''صمد بالذات'' ہے۔ جب تک انسان کمال کو فنا اور ہلاک ہو جانے والی مخلوقات میں تلاش کرتا رہے گا ہمیشہ محروم اور پس ماندہ ہی رہے گا کیونکہ **کلُّ شئیٍ ھالِک'' الّا وَجْھَہُ** (سورۃ قصص: آیت ۸۸)۔

(ii) وہ زندگی جو بلا، زوال، اذیتوں اور تکلیفوں سے پاک ہو مادّیت و جسمانیات کے ہیولٰی اور پیرائے میں ہرگز نہیں مل سکتی۔ بلکہ جس عالم میں مطلوبہ زندگی حاصل ہو سکتی ہے اس کا نام ملکوت اور آخرت ہے۔ پس انسان کے لیے لازمی ہے کہ اپنی توجہات کا مرکز آخرت کو بنائے نہ کہ حیاتِ مادّی پر فریفتہ و دلباختہ رہے۔ آخرت پر ایمان بھی ہو اور ایمان کے ہمراہ ایسی کوشش بھی جو انسان کے خلوص اور دیانتداری کا ثبوت فراہم کرے. جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے: **من اراد الآخرۃ و سعی لھا سعیھا و ھو مومن فاولئک کانَ سعْعُھُم مشکوراً** ۰ (سورۃ بنی اسرائیل: آیت ۱۹)

(iii) اگر انسان فطرت کی راہ سے کمالِ حقیقی کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو لازمی ہے کہ ان انسانوں کے ساتھ وابستہ اور متمسک ہو جائے یعنی اُن کے ساتھ رشتہ ولایت کو قائم کر لے جو خود فطرت پر قائم ہیں، راہ سے اچھی طرح باخبر ہیں، دیانت دار ہیں، یعنی پوچھنے والے کو صحیح راہ سے آشنا کراتے ہیں اور بخیل بھی نہیں ہیں۔ **و ما علی الغیبِ بضنین** (سورۃ تکویر ۸۱: آیت ۲۴) **ترجمہ: اور وہ (رسول ﷺ غیب پر بخیل نہیں ھے.** بلکہ اس درجہ سخی اور دریادل ہیں کہ چاہتے ہیں کہ جہاں تک وہ خود پہنچے ہیں وہاں تک دوسروں کو بھی پہنچا دیں: ''**لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ.**'' (سورۃ احزاب: آیت ۲۱) **ترجمہ: بے شک تمھارے لئے اللہ کے رسول ﷺ میں حسین نمونئہ (زندگی) موجود ھے.**

پس حتمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نفسِ انسانی فطرت سے ابھرنے والی ہدایت سے بے بہرہ اور غافل رہتے ہوئے کبھی بھی اپنی حقیقت کو نہیں جان سکتا۔ لیکن کیونکہ مادیت کے دباؤ اور شیطنت

کے وسوسوں کی وجہ سے فطرت کی گہرائیوں میں نظر کرنا اکثریت کے لئے تقریباً ناممکن ہے لہٰذا اللہ نے اپنی رحمت و مِنّیت سے نفس کی رہنمائی دین حنیف کی طرف فرمائی جو انسان اور انسانیت کو افراط وتفریط سے محفوظ رکھنے کا ضامن ہے اور جس کی اساس توحید، آخرت اور رسالت و امامت پر مبنی ہے۔ یہ دین انسان کے فطری تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے اور نفس کو عروج عطا کرنے کا افضل ترین وسیلہ بھی ہے۔ دین کی پکار کو نظر انداز کر دینا اور انبیاء کی تعلیمات سے بے توجہی برتنا سبب بنتا ہے اس مصیبت کے نازل ہونے کا کہ انسان فطری ہدایت سے کما حقہ مستفید نہ ہو سکے اور فطرت کے خزانے کو ضائع کر بیٹھے۔ اور اگر زندگی اس حالت میں گذرتی رہی کہ فطرت پر پردے پڑے رہیں تو نفس کا مقدر ضیاع اور زیاں ہے جس سے آخرت میں نجات حاصل کرنا اگر ناممکن نہیں تو بے انتہا دشوار ضرور ہے۔

نتائج پر چند سوالات اور انکے جوابات

سوال (۱): فطرت اور فطری ہدایت کی موجودگی کے باوجود انسانوں کی اکثریت گمراہ اور بدکردار کیوں ہے؟ ان کی فطرت انہیں حق کی جانب کیوں مائل نہیں کرتی۔

جواب :۔ ایک بہترین ڈیزائن اس بات کی ضمانت نہیں فراہم کرتا کہ اس کے مطابق بننے والی عمارت یا مشین بھی بہترین ہوگی۔ فطرت، انسان کا بنیادی ڈیزائن ہے جس میں انسانی ترقی کے لیے سارے امکانات اور ہدایات موجود ہیں۔ لیکن یہ خود انسان یا اُس کا نفس ہے جسے اس بات کا سو فیصدی اختیار دیا گیا ہے کہ وہ فطری راہ کو منتخب کرے یا اسے ترک کر کے کسی اور راہ پر چل نکلے۔ نفس کو ارادی اختیار حاصل ہے کہ فطری ہدایت سے بہرہ مند ہو یا فطرت کو ہوا و ہوس اور شہوات ِمادّی کے قید خانے میں بند کردے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک اچھا Design معمار (Constructor) کی بددیانتی کی وجہ سے ناقص عمارت کی تعمیر کا سبب بن جاتا ہے اسی طرح فطرت کی موجودگی کے باجود نفس عیوب اور نقائص سے بھرپور بلکہ نجس بھی ہوسکتا ہے۔

سوال (۲): آپ کے جواب سے مزید دو سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ اب تک یہ کاملاً واضح نہیں ہوا کہ ''انسان کا نفس'' کیا چیز ہے اور اس کی کیا حیثیت و اہمیت ہے؟ اور دوسرا یہ کہ کیا انسان مکمل طور پر با اختیار ہے کہ اچھائی اور برائی میں سے جس کو چاہے منتخب کرے۔ اس سے بھی اہم یہ کہ کیا انسان کا اختیار نفس کے مقدرات پر اثر انداز ہوتا ہے یا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے سو فیصدی اختیار دینے کی جو بات کی ہے کیا اس سے ایسا ہی تاثر نہیں پیدا ہو رہا؟

جواب: جہاں تک نفس کی تفصیلی تعریف اور متعلقہ امور کا سوال ہے تو ان کا جواب ہم انشاء اللہ آنے والے ابواب میں دیں گے۔ لیکن سوال کے دوسرے حصے کے جواب میں ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ عملاً انسان با اختیار ہے کہ فطری ہدایت کو قبول کرے یا رد کر دے لیکن نتیجے پر انسان کا اختیار یا قابو نہیں ہے۔۔ سورۃ دہر یا سورۃ انسان کی ابتدا میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے خلق کیا اور اسے قوائے سماعت و بصارت عطا کئے تا کہ وہ ھدایتِ فطری سے مستفیض ہو سکے پھر اسی پر بس نہیں بلکہ ''اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوۡرًا'' (سورۃ دھر: آیت ۳) یہاں ''هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡل'' سے مراد فطری اور اس پر اضافی وحی کے ذریعہ سے ہدایت ہے جو تعلیماتِ انبیا سے ملحق ہو جاتی ہے۔ ہدایتِ الہامی اور وحیانی کے عطا ہونے کے بعد انسان کلاً با اختیار ہے کہ اس ''جامع ہدایت'' کے بارے میں شکر گزار بنے یا کافر۔ لیکن اس عنوان سے با اختیار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دونوں اختیاری صورتوں میں انسان کو اطمینان، سکون اور کامیابی نصیب ہوگی۔ یعنی چاہے انسان فطری و دینی راہ کو منتخب کرے یا

شیطان کی پیروی کرے دونوں صورتوں میں کامیابی کو حاصل کرے گا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ دونوں کامیابیوں کی نوعیت مختلف اور جداگانہ ہوگی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ کامیابی صرف فطری راہ کو طے کرنے سے ہی نصیب ہوگی (اور فطری راہ وہی ہے جسے دین خدا آشکارا کرتا ہے۔ سورۂ روم ۳۰) اس کامیابی کا نام بہشت اور جنت ہے۔ فطرت کی مخالف راہ کو طے کرنا اگرچہ انسان کے اختیار میں ہے۔ لیکن اس کا حتمی اور لازمی نتیجہ دائمی بدبختی، سقوط اور محرومی ہے، وہ تباہی جس کا نام دوزخ اور جہنم ہے۔ مذکورہ مطلب کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنا ہو تو سورہ **بنی اسرائیل کی آیات ۱۸، ۱۹ اور ۲۰** میں غور فرمائیں کہ اللہ، عاجل (یعنی دنیائے ظاہری و مادّی) اور آخرت کے انتخاب کا مسئلہ انسان کے اختیار پر منحصر قرار دے رہا ہے (**وَمَنْ اَرَادَ**) لیکن دونوں کے نتائج کو ایک حتمی اور لازمی حقیقت کے طور پر بیان فرما رہا ہے جسے تبدیل یا معین کرنے کا اختیار ہرگز ہرگز انسان کے پاس نہیں ہے۔ اسی طرح سورۂ شوریٰ آیت ۲۰ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''**مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ.**'' **ترجمہ**: جس نے ارادہ کرلیا آخرت کی کھیتی (کو حاصل کرنے) کا تو ہم اُس کے لئے اُس کی کاشت (آخرت کے فائدہ) کو زیادہ کر دیتے ہیں اور (اس کے برخلاف) جس نے دنیا کی کھیتی کا ارادہ کیا تو ہم اسے، اسی میں سے دیتے ہیں لیکن اُس (دنیا چاہنے والے) کے واسطے آخرت میں کوئی نصیب (حصہ) نہیں ہے۔ اگر آپ آیت کے متن میں غور فرمائیں تو یہ امر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ دنیا یا آخرت کے انتخاب کا مرحلہ نفس کے ارادہ اور اختیار پر منحصر ہے لیکن نتیجہ نفس کی مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ بلکہ دونوں choices کا نتیجہ اور انجام ایک اصول کی شکل میں بیان کر دیا گیا ہے، جس سے گریز اور مفر کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ یعنی جو انسان بھی آخرت کی زندگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے حالتِ ایمان میں کوشش اور محنت نہیں کرتا، وہ حیاتِ اُخروی میں کسی نصیب اور اجر کا حقدار نہیں ہوگا بلکہ وہاں دُھتکاری ہوئی حالت میں قابلِ مذمت زندگی گزارنے پر مجبور ہوگا۔

سوال (۳): اگر کوئی انسان فطری ہدایت سے بہرہ مند ہو تو کیا اُسے نبی اور امام کی ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

جواب: اِس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے، فطرت کی موجودگی کی وجہ سے انسان حق جُو اور حق شناس بنتا ہے، فطرت انسان کو صحیح اور غلط کا تصور، حق و باطل کا شعور اور مزید برآں توحید سے آگہی عطا کرتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ فطرت کی موجودگی تعلیم و تربیت کی افادیت اور الٰہی اساتذہ کی اہمیت کو غیر ضروری بنا دیتی ہے۔ بلکہ حقیقتاً فطرت وہ میدان ہموار کرتی ہے جس میں انبیا کا شتکاری کرتے ہیں اور فطری ہدایت کی وجہ سے ہی قلب کی آنکھیں کھلتی ہیں جو انبیاءؑ کی تعلیمات کے زیر اثر اللہ کی بزرگ آیتوں کو دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ پس فطرت ایک Secure Foundation ہے جس پر بننے والی عمارت نبی اور امام کی پیروی سے تعمیر ہوتی ہے اور اُس عمارت کا مسکن بلاشک و شبہ بہشتِ بریں اور جنت الفردوس ہے۔

سوال (۴): اِس بات کی شناخت کیسے ممکن ہے کہ کوئی انسان فطرت کی راہ پر قائم ہے یا اس سے منحرف ہے؟

جواب: فطرت کی بنیاد توحید پر ہے۔ لہٰذا ہر وہ انسان جو موحد ہو اور شرک سے پاک زندگی بسر کرتا ہو، وہ حقیقتاً فطرت پر قائم ہے اور فطری ہدایت سے بہرہ مند اور مستفید ہے۔ ایسا انسان نہ صرف قرآن اور کلامِ معصومؑ میں پنہاں حقائق اور اسرار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، بلکہ اُس کا وجود

کائنات میں موجود الٰہی تجلیّات کو وصول اور جذب کرنے کی قابلیّت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ فطرت‘ توحید اور شرک کے باہمی ربط کو سمجھنے کے لیے ہم سورۂ یونس کی آیات ۲۲ اور ۲۳ کی جانب رجوع کر سکتے ہیں۔ اِن آیات سے اخذ ہونے والے مفاہیم کو مندرجہ ذیل نکات میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

☆ انسان اپنے فائدے اور تجارت کے واسطے خشکی اور سمندروں‘ دریاؤں میں سفر کرتے رہتے ہیں اور اِس دوران ایک موقع وہ ہوتا ہے کہ وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں ایسے وقت میں کہ موسم بہت خوشگوار ہو اور لطیف ہوائیں چل رہی ہوں۔ لیکن تھوڑے وقفے کے بعد موسم میں اچانک تبدیلی آ جاتی ہے اور تیز و تند ہواؤں کے جھکڑ چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کشتی کو چاروں طرف سے بلند و بالا موجیں گھیر لیتی ہیں اور تمام مسافروں کو اپنی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگتی ہے۔ غور فرمائیے کہ وہی ہوائیں جن پر کشتی کے چلنے کا دارومدار تھا‘ وہ وسیلہ جسے انسان اپنا سرمایہ سمجھ رہا تھا‘ اب وہی شئے کشتی کو تباہ کرنے اور اُس پر سوار انسانوں کی جان لینے کے درپے ہے۔

☆ اِس مصیبت کے لمحے میں لوگوں کو نظر آنے لگا کہ وہ چاروں طرف سے گھر چکے ہیں۔ وہ ہوا جو تھوڑی دیر پہلے خوشگوار اور کشتی کی روانی کا باعث تھی‘ اب اُسے تباہ کرنے پر آمادہ ہے اور وہ پانی جو اَب تک کشتی کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا‘ اُسے غرق کر دینے کے لیے تیار ہے۔ پس اِن مشاہدات نے کشتی پر سوار انسانوں کے لیے اِس امر کو واضح کر دیا کہ جن اسباب و وسائل کو ہم حقیقت سمجھ کر اُن پر تکیہ اور بھروسہ کرتے ہیں وہی کبھی کبھی ہماری جان کو ختم کرنے کے لیے منہ پھاڑے کھڑے ہوتے ہیں۔

☆ تمام اسباب و وسائل کے منقطع ہو جانے کے بعد بھی انسان کا قلب‘ اُس کا وجود ایک ہستی کا معتقد ہے جو اِس حال میں بھی اُسے ہلاکت سے نجات دلا سکتی ہے۔ وہ ہستی کون ہے؟ وہ اللہ ہے‘ معبودِ حقیقی اور رب العالمین۔ کیا یہ احساس صرف مسلمانوں کو ہوتا ہے؟ جی نہیں! یہ شعور تمام انسانوں کے پاس ہے۔ اِس میں کسی مذہب اور عقیدے کی قید نہیں ہے۔ یہ یقین کہاں سے برآمد ہو رہا ہے کہ جب کوئی بچانے والا نہیں ہوتا‘ جب سارے اسباب ختم ہو جاتے ہیں‘ تب بھی ’’کوئی‘‘ ہوتا ہے جو نجات عطا کر سکتا ہے؟ اِس یقین کی جڑ فطرت ہے جو تمام انسانوں کے پاس ہے۔

☆ انسان کی فطرت پر ظاہر بینی‘ وسواس و توہمّات اور مادّی خواہشات و میلانات کے دبیز پردے پڑے رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی اللہ ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ وہ تمام چیزیں جن پر انسان کو اعتماد تھا‘ اُسے داغِ مفارقت دے جاتی ہیں۔ اُس لمحے فطرت قید سے آزاد ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ انسان ’’مخلصین‘‘ کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے اور توحیدِ حقیقی کا پکارنے والا بن جاتا ہے: ’’**دَعَوُا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ**۔‘‘ (سورۂ یونس۔ آیت ۲۲) **ترجمہ: وہ اللہ کو پکارنے لگتے ہیں اس حالت میں کہ اپنے دین میں اللہ کے لئے مخلص ہو چکے ہوں** ۔ یہ حیرت انگیز وقوعہ ہے کہ صرف ایک جان لیوا حادثہ کے خوف نے ایک عام انسان کے دین کو اللہ کو واسطے خالص کر دیا ہے۔ ہم سب کو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ رہی ہے کہ اِن افراد نے طوفان کے آنے کے بعد کوئی درس نہیں پڑھا تھا جس نے اُن کو مخلص بنا دیا بلکہ اِس بے بسی اور لاچارگی کی حالت میں اُن کی فطرت میں دبی ہوئی توحید ابھر کے سامنے آ گئی ہے۔ پس ثابت ہوا فطرتِ انسان ’’توحیدِ خالص‘‘ سے تعلق اور رابطے کے سوا اور کسی چیز کا نام نہیں ہے۔

☆ لیکن سب سے حیران کن مرحلہ اُس وقت سامنے آتا ہے کہ جب اللہ کشتی اور مسافروں کو بحفاظت ساحل تک پہنچا دیتا ہے‘ تو یہ لوگ تمام گزرے ہوئے مراحل کو بھول جاتے ہیں‘ اللہ کے

ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو فراموش کر دیتے ہیں اور زمین پر قدم رکھتے ہی سرکشی اور طغیان کے راستوں پر چل پڑتے ہیں۔

☆ سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۶۵ اور ۶۶ میں اللہ نے اس رویّے کو شرک سے تعبیر کیا ہے: "**فلما نجا هم الى البر اذاهم يشركون .**" **ترجمہ: پھر جب ہم اُن کو نجات دے کر خشکی تک پہونچا دیتے ہیں تو وہ (نجات یافتہ افراد) شرک کرنا شروع ہو جاتے ہیں.** لہٰذا اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارنا اور متوجہ ہونا فطرت ہے اور اِس کے برعکس ذاتی اور مادّی مفادات کی ہوس سے مغلوب ہوکر اللہ کو بھول جانا شرک ہے اور خلافِ فطرت ہے۔ مشرکانہ رویّہ کی یہ تعریف ہم اپنی طرف سے نہیں بیان کررہے بلکہ خدا کا یہ فرمانا کہ: **ليكفروا بما اتينا هم و ليتمتعو**" جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنی مصیبت کے وقت اللہ سے پُرخلوص دعائیں کرتے ہیں اور سکون واطمینان کے ماحول میں مشرکانہ رویے اختیار کرلیتے ہیں، وہ اِس لیے شرک کرتے ہیں تاکہ جو کچھ اللہ نے اُنہیں عطا کیا ہے اُس میں کفران اور ناشکری کریں اور منعمِ حقیقی کو فراموش کر کے لذت ظاہری سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہوسکیں۔ یہاں اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی بے حد ضروری ہے شکر کے ارکان میں سب سے پہلے مُنْعِم (**جس نے نعمت عطا کی ہے**) کی معرفت اور نعمت کو اُس کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرنا، شامل ہیں۔ شکر فقط زبان سے الحمدللہ کہتے رہنے کا نام نہیں ہے۔

یہ خطاب دلیل ہے کہ جب انسان کفرانِ نعمت پر آمادہ ہو جائے، دنیاوی فائدوں کی خاطر اللہ کو فراموش کر دے، تو اُس کی زندگی موحدانہ نہیں بلکہ مشرکانہ گزر رہی ہوتی ہے۔ انسان ایسا کیوں کرتا ہے؟ اِس لیے کہ اُس کے خیالِ خام میں اللہ انسان کو دنیوی لذّتوں سے فائدہ اٹھانے سے روکتا ہے۔ یہ بات ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اِس نوعیت کے خیالات محض وساوسِ شیطانی سے جنم لیتے ہیں کیونکہ جب اللہ نے دنیا کی تمام نعمتیں خلق ہی انسان کے واسطے کی ہیں تو وہ انسان کو نعمتوں کے استعمال سے کیوں روکے گا؟ ہاں، یہ معاملہ یقیناً ہے کہ اللہ کے قانون میں ایسی بے مہار آزادی کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان ہر ضابطہ اور قاعدہ سے آزاد ہوکر ہوسِ زر و زمین کو پورا کرے۔ بہت سے انسانوں کی بدبختی ہے کہ وہ اپنے نفوس کو مہذب بنانے کے بجائے ہوس پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں لہٰذا، اِس قبیل کے انسان نے ترکیب یہ نکالی کہ خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کر کے اپنے مذموم مقاصد کے لیے راہیں وضع کرلیں۔ مثلاً کہیں وہ اپنی غلط کاریوں کے لیے معاشرہ کو اور کہیں بیوی اور کبھی اولاد کا بہانہ بناتا ہے کہ میں اِن کی وجہ سے مجبور ہوں کہ زیادہ دولت کماؤں اور اپنا status بڑھاؤں۔ گویا کہ معاشرہ اور زوجہ اور اولاد اللہ کے احکامات میں شریک ہیں جن کی تعمیل بھی واجبات میں سے ہے۔

لہٰذا اِس طویل وضاحت کے بعد اِس امر کو بخوبی سمجھنے میں قطعاً دشواری نہیں ہونا چاہیے کہ جو زندگی عملاً توحیدی ہو وہ مطابقِ فطرت ہے اور جس زندگی میں ظاہری، مادّی اور فنا ہونے والی لذتوں سے مستفید ہونے کی خاطر قدم قدم پر اللہ کی بندگی اور طاعت سے سمجھوتہ (compromise) ہوتا رہے، مشرکانہ اور خلافِ فطرت ہے۔

بابِ سوم

اساسی مفاہیم برائے شناختِ نفس

اب ہماری گفتگو فطرت سے آگے بڑھ کر نفس تک آن پہنچی ہے۔ لفظِ ''نفس'' قرآنِ کریم میں سینکڑوں مرتبہ آیا ہے اور گونا گوں ابعاد (Multiple dimensions) کا حامل ہے۔ لیکن ایک مطلب جو نفس کے حوالے سے واضح طور پر آشکار ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ نفس انسان کے وجود کی اصل اور حقیت کا نام ہے۔ یعنی اگر ہم سے پوچھا جائے کہ ''تم کون ہو؟'' تو ہم شاید جواب میں اپنا نام بتا دیں لیکن اگر سوال کرنے والا پھر کہے کہ ''میں تمہارے بارے میں پوچھ رہا ہوں، کہ تم حقیقتاً کون ہو؟'' تو ممکن ہے کہ ہم جواب میں کہیں کہ ''میں، میں ہوں'' ۔ پس جس شخصیت یا حقیقت کو آپ 'میں' کہتے ہیں اور اُس کی طرف اپنی ہر کیفیت، تجربہ اور احساس کو نسبت دیتے ہیں، بس سمجھ لیجئے کہ وہی آپ کا نفس ہے۔

فطرت اور نفس کا باہمی ربط و تعلق؟

فطرت اور نفس کے فرق کو اگر سمجھنا ہو تو کسی عمارت کی تعمیر کے مشاہدہ سے ایک عمدہ مثال سامنے آتی ہے۔ جب کوئی عمارت تعمیر کرنا ہوتی ہے تو سب سے پہلے ایک محفوظ اور stable قطعہَ ارضی تلاش کیا جاتا ہے۔ آتش فشانی علاقے یا دلدلی زمین پر عمارت بنانے سے گریز کیا جاتا ہے' تا اینکہ اُس کی یہ قباحتیں ختم نہ ہو جائیں۔ یہ محفوظ اور قابلِ بھروسہ زمین جو اصلِ بنیاد ہے ''فطرت اللہ'' کے مترادف ہے۔ جس طرح زمین کے بغیر عمارت بنانا ناممکن ہے اسی طرح اگر اللہ کی قائم کردہ بنیاد فراہم نہ ہو تو وجودِ نفس کی کوئی عمارت بھی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ زمین مہیّا ہونے کے بعد سب سے پہلا مرحلہ عمارت کی بنیاد (Foundation) بنانے کا درپیش ہوتا ہے۔ یہ بنیادِ ثانی جس پر ساری عمارت کا دارومدار ہوتا ہے محکم زمین پر قائم کی جاتی ہے اور بذاتِ خود لوگوں کی نظروں سے پنہاں اور پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس تعمیر کردہ بنیاد یا Foundation کو فطرتِ انسانی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لوگ عمارت میں تبدیلی اور چھیڑ چھاڑ کر سکتے ہیں لیکن بنیاد کو چھیڑنے کا کوئی موقع اُن کے پاس نہیں ہوتا۔ پس وہ تمام مطالب جو ہم نے آیۂ فطرت میں بیان کیے اِس مثال سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ یعنی فطرتِ انسانی کی بنیاد کا فطرت اللہ پر استوار ہونا اور فطرت کا اصولی طور پر ناقابلِ تبدّل و تغیر ہونا۔ بنیاد ڈالے جانے کے بعد اُس پر عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہو جاتا ہے جو ایک طویل عرصے تک جاری رہتا ہے۔ اگر ہم زمین کو ''فطرت اللہ'' اور بنائے عمارت کو ''فطرتِ انسان'' سے تعبیر کریں' تو زیرِ تعمیر عمارت کو ''نفسِ انسان'' کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس عمارت کا معمار سوائے انسان کے اور کوئی نہیں ہے۔ یعنی ہر انسان خود اپنے نفس کی عمارت بنانے کا ذمے دار ہے۔ اللہ کی عطا کردہ بنیاد (فطرت) جس پر نفس کی عمارت ارتقا پاتی ہے اِس قدر مضبوط ہے کہ اگر انسان چاہے اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرے' تو اِس عمارت کو ''عرشِ الٰہی'' تک بلند کر سکتا ہے۔ نفسِ انسانی کے اس محیّر العقول complex کو تعمیر کرنے کے لیے مواد اور مصالحہ (construction material) اللہ کے لامتناہی فیض اور عطا و رحمانیت سے نصیب ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے : **كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَ هٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا** (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۲۰) ترجمہ: ہم سب کی مدد کرتے ہیں، اِن کی بھی اور اُن کی بھی (مطلب یہ کہ اہلِ دنیا اور آخرت دونوں اللہ کی مدد سے فائدہ اٹھاتے ہیں) تیرے رب کی عطا سے اور تیرے رب کی عطا کسی سے رُکی ہوئی نہیں ہے۔ لیکن اس Material کا صحیح یا غلط استعمال انسان

کے ارادہ اور اختیار پر منحصر ہے۔ اگر دیانتداری اور پرخلوص محنت کے ساتھ یہ عمارت بنائی جائے گی، تو نفس کا حُسن اور کمال (آخرت میں) قابلِ دید ہوگا، ورنہ نفس کی عمارت ایک تباہ حال کھنڈر اور خرابے سے زیادہ کچھ نہ ہوگی۔

تنبیہ: قارئینِ کرام سے درخواست ہے کہ ہماری بیان کردہ مثال کو اُسی تناظر میں سمجھیں جس میں ہم نے اُسے پیش کیا ہے۔ یعنی ایک عمارت کے مختلف اعضاء کے ربط کو سمجھتے ہوئے وجودِ انسانی کی مختلف جہتوں کے باہمی ارتباط (Relationship) کا ادراک حاصل کرنا۔ کوئی تشبیہ بالکل مطابق العین نہیں ہوتی اور وہ بھی اُس وقت جب زیرِنظر حقیقت ماورائے مادّہ اور ظاہری مشاہدہ سے بالاتر ہو۔ اگر کوئی صاحب ہمارے یہاں رائج ٹھیکیداری نظام کو اِس مثال پر منطبق کرنے کی کوشش کریں گے، تو یقیناً فکر کا رُخ غلط سمت میں موڑ دینے کا ذریعہ فراہم کریں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا کہ اگر ہم انسان کی ''مَیں'' کو نفس کہیں تو شاید یہ نفس کی سب سے بہتر تعریف ہوگی۔ اِس لحاظ سے ہر انسان کا نفس ایک جداگانہ حقیقت ہے اور انفرادیت کا حامل ہے۔ یہ نفس ہی ہے جس سے انسان کے آثار اور خصوصیات ہویدا اور نمودار ہوتے ہیں، اور جس کے مرکز (قلب) میں انسان کے افکار اور اعمال کے نتائج محفوظ ہوتے ہیں۔ انسان کی نہ صرف شخصیت اُس کے نفس کی حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہے بلکہ انسان کے اعمال بھی نفس کی حالت کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۸۴ میں یوں بیان فرمایا ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ. جس کا معنی یہ ہے کہ (اے پیغمبر ﷺ) کہہ دو کہ ہر (شخص) اپنی شاکلہ (حالتِ نفس) کی بنیاد پر عمل کرتا ہے۔

نفس ہدایتِ فطری سے بہرہ مند ہوتا ہے لیکن اپنی راہ کے انتخاب میں کاملاً آزاد اور خود مختار ہوتا ہے۔ ابتدائے خلقت میں جوہرِ نفس اگرچہ ہدایتِ فطری کی موجودگی کی وجہ سے ایک سادہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں ہوتا لیکن ایک صلاحیت اور استعدادِ محض (Pure-potential) سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے۔ بعد از آں خداداد اختیار کی بنا پر اور جسم و روح کی مدد سے نفس رفتہ رفتہ متعدد ارتقائی مراحل سے گذرتا ہوا ایک وجودی حقیقت بن جاتا ہے اور ''بلوغت'' کے مرحلہ تک پہونچنے کے بعد اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی علیحدہ اور جداگانہ شناخت کو اپنے تجربات کے ہمراہ محفوظ رکھ سکے اور مختلف عوالم میں زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

اس بات کے سمجھانے کے لیے کہ ابتدا میں نفسِ انسانی ایک حقیقتِ بالقوہ یا Pure potential ہوتا ہے، ہم سورۂ نحل کی آیت نمبر ۷۸ سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں:

''وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.'' ترجمہ: اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے باہر نکالا اس حالت میں کہ تم کسی شے کا علم نہیں رکھتے تھے اور قرار دئے تمہارے لئے سماعت اور بصارت اور قلب، امید ہے کہ تم شکرگزار بن جاؤ۔ اس آیت میں ''كُمْ'' سے مراد حقیقتِ انسان یا اُس کا نفس ہے۔ آیت کے بیان میں واضح ہے کہ ابتدائے خلقت میں نفس کسی شئے کا عالم نہیں ہوتا، بلکہ 'سمع' 'بصر' اور 'فوئاد' کی صورت میں وہ صلاحیت اور استعداد لے کر پیدا ہوتا ہے جس کے وسیلے سے مستقبل میں عالم اور عارف بن سکے اور اپنے لیے ایک کردار اور شخصیت کی تخلیق کر سکے۔ ''سمع'' سننے اور پھر سنی ہوئی بات پر غور و فکر کرنے کی صلاحیت کا نام ہے، 'بصر' کا تعلق دیکھنے اور پھر منظر کے پیچھے پوشیدہ حقائق کا مشاہدہ کرنے اور تجزیہ و تحلیل کی قابلیت سے ہے اور ''افئدۃ'' کا مطلب ہے ایک حرارت سے بھرپور پُرجوش قلب جو وجودِ انسانی میں تجسس اور تحرک کے پیدا

کرنے کا سبب بنتا ہے۔غور فرمایے کہ اللہ نے اُذُن (کان) اور عین (آنکھ) کے الفاظ استعمال نہیں فرمائے' کیونکہ کان' آنکھ اور دل رکھنے والے بہت سے انسان درحقیقت بہرے' اندھے اور گونگے ہوتے ہیں: **صمّ'' بکم'' عمی'' فھم لا یرجعون** (سورۃ بقرہ: آیت ۱۸) **ترجمہ:** بہرے، گونگے اور اندھے ہیں پس اُن کے واسطے (راہِ حق کی جانب) پلٹنا ممکن نہیں۔

ارکانِ معرفتِ نفس

قبل اس کے کہ ہم آیاتِ قرآنی کی روشنی میں نفس کی حقیقت اور خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالیں' نفسِ انسانی کی درست شناخت کے حوالے سے کم از کم تین بنیادی مطالب کو واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ مطالب درج ذیل ہیں:

(ا) نفسِ انسان مسلسل حالتِ ارتقا یا تنزل میں رہتا ہے اور کبھی بھی ساکت اور جامد نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر نفس میں ہر لمحے یا تو رفعت اور بلندی پیدا ہو رہی ہوتی ہے یا وہ سقوط اور پستی کی حالت سے دوچار ہوتا ہے۔اس بات کو سمجھانے کے لئے ہم یہ تشبیہ دے سکتے ہیں کہ جس میدان یا Domain میں نفس زندگی بسر کر رہا ہے وہ عمودی (Vertical) ہے نہ کہ افقی (Horizontal)۔لہٰذا نفسِ انسانی کو نہ صرف اوپر جانے کے لئے بلکہ اپنے مقام پر باقی رہنے کے لئے بھی جدّ و جہد کی ضرورت ہے، معمولی سی غفلت بھی سقوط کا سبب بن سکتی ہے۔مسلسل تنزل یا ارتقاء کی حالت میں رہنے کی وجہ یہ ہے نفس کی حالت یا مثال ایک Photographic film جیسی ہے اور انسان کی سماعت و بصارت وہ Apertures یا Openings ہیں جن کے ذریعے سے ہمہ وقت بیرونی ماحول یا عالمِ خارج سے شعائیں نفس پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں یہ عمل ہر وقت جاری رہتا ہے چاہے ہم متوجہ ہوں یا نہ ہوں۔جذب ہونے والے اثرات نیت اور ارادے کے ساتھ مخلوط ہو کر نفس میں Process ہوتے ہیں جس کا ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور یہ نتیجہ انسان کو رُشد یا سقوط عطا کرتا ہے۔

مثال: انسان کا گزر ایسے مقام سے ہوا جہاں کچھ فحش تصاویر آویزاں تھیں۔اب وہ چاہے یا نہ چاہے لیکن ان تصاویر کا تاثر آنکھوں کے ذریعے سے نفس کی جانب منتقل ہو جائے گا۔ اب اگر نفس ان اثرات کو شہواتِ جنسی کے ساتھ مخلوط کر کے Process کرے تو نفس میں حیوانی اثرات غالب آ جائیں گے' نفس اپنے مقام سے نیچے سقوط کرے گا اور نتیجہ یہ برآمد ہو گا کہ انسان اپنی حیوانی خواہشات کی تسکین کے لیے سرگرداں ہو جائے گا' یہاں تک کہ اس بارے میں حلال و حرام سے بھی بے نیاز ہو جائے گا۔لیکن اس کے علاوہ ایک اور صورت بھی ممکن ہے' اور وہ یہ کہ نفس مذکورہ اثرات کو جذب کرنے کے بعد ہدایتِ فطری و دینی کو بروئے کار لائے جو رہنمائی کرتی ہے کہ ایسے تمام اعمال منحوس اور مبغوض ہیں جو فحشاء پر مبنی ہوں، ان کو قبول کرنا انسانیت کی اقدار کے خلاف اور انسانی معاشرے کے تانے بانے کو برباد کرنے کا سبب ہے۔نفس میں اِس Processing کا نتیجہ یوں ظاہر ہو گا کہ انسان پست و زشت اعمال سے نہ صرف نفرت کرے گا بلکہ اِس امر کے لئے بھی کوشاں رہے گا کہ کبھی بھی فحشاء کو قبولیت کی نظر سے نہ دیکھے اور اس سے بڑھ کر جہاں بے حیائی نظر آئے وہاں اُس کے خاتمے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ یہاں پر غور فرمایئے کہ بیرونی اثرات نفس تک ہر حال میں پہنچیں گے لیکن اپنے ارادے اور نیت کی بنا پر نفس ایک جداگانہ Reaction اور Response تخلیق کرے گا اور یہ سلسلہ مدام جاری و ساری رہے گا، جب تک انسان عالمِ تکلیف یا امتحان میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ نفس جو بھی نتیجہ بالآخر برآمد کرے گا وہ مرکزِ نفس یعنی قلب میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو کر مَلِکاتِ نفسانی کی تشکیل

کا سبب بنتا رہے گا۔

(۲) نفسِ انسانی ایک ابدی حقیقت کا نام ہے اور دائماً عالمِ مسافرت میں ہے۔ نفس کے مسافر ہونے کے حوالے سے قرآن کا بیان بہت واضح ہے جب **سورۃ انشقاق** کی آیت ۶ میں ارشاد ہوا: **یاایُّھا الانسانُ اِنّکَ کادِحٌ الی رَبِّکَ کدْحاً فَمُلٰقیه** • **ترجمہ**: اے انسان، تُو (خستہ و شکستہ) کر دینے والی زحمت اُٹھاتے ہوئے اپنے رب کی طرف بڑھتا رہے گا یہاں تک کہ اُس سے ملاقات کرلے۔ اور اسی سورۃ کی آیت ۱۹ میں بیان ہوا کہ: **لَتَرْکَبُنَّ طبقاً عنْ طبقٍ** یعنی تم کو حتماً ایک طبقے (منزل) کے بعد دوسری منزل پر سوار کرایا جاتا رہے گا۔ نفس مسافر ہے اپنے رب کی سمت، یعنی منزل اللہ ہے؛ اس سفر کے دوران وہ ایک عالَم سے دوسرے عالَم کی جانب منتقل ہوتا رہے گا لیکن اِس التزام کے ساتھ کہ ہر آنے والا عالَم پچھلے اور پیچھے رہ جانے والے عالَم سے منزلت میں بالاتر ہوگا۔ اور دقیق ترین نتیجہ یہ کہ کیونکہ نفس کی منزل لقائے خدا ہے اور اللہ لامحدود ہے لہٰذا نفس کا سیر و سفر بھی حد و انتہا نہیں رکھتا۔

ہم نے پچھلے باب میں فطرت کے بارے میں عرض کیا تھا کہ اسے مارا یا ختم نہیں کیا جاسکتا اسی طرح نفس کے حوالے سے بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اس جوہر کو بھی ہمیشہ باقی رہنا ہے اور بقول پیغمبر اکرمؐ انسان کی حقیقت (یعنی اس کا نفس) بقا کے لیے خلق ہوا ہے نہ کہ فنا کے واسطے؛ البتہ وہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہوتا رہے گا۔ یہاں پر نامناسب نہ ہوگا اگر علامہ طباطبائی کا یہ لطیف نکتہ بھی نقل کر دیا جائے کہ جب بھی علامہ کے سامنے حرف ''ابد'' یعنی ہمیشگی کا ذکر آتا تھا ' تو اُن کی حالت دگرگوں اور متغیر ہو جاتی تھی اور فرماتے تھے کہ ''ہمارے سامنے ابد درپیش ہے لیکن خوف دلانے والی سچائی جس سے کوئی راہِ فرار اختیار نہیں کرسکتا یہ ہے کہ ہماری مہلت اور تیاری والی زندگی کی مدت اِس دنیا (عالمِ مادّیت) میں محدود اور معین ہے۔ ہمیں اسی زندگانی کی مسافت کے دوران اپنے آپ کو ابد کے لیے بنانا اور تیار کرنا ہے؛ وقت کس قدر کم ہے!!''

(۳) نفس کی صحت اور ترقی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ نسیان اور غفلت ہیں اور سب سے اہم امور؛ توجہ (**انابہ**) اور بیداری (**یقظہ**) ہیں۔ اگر ہم **انابہ** اور **یقظہ** کو جمع کر دیں تو ''**ذکر**'' وجود میں آجاتا ہے، **ذکر** کا مطلب یاد (Remembrance) ہے یعنی انسان ہمیشہ اللہ کی یاد میں مشغول رہے۔ بالفاظِ دیگر نفسِ انسانی کے لیے لازمی ہے کہ وہ ہمیشہ غفلت سے پرہیز کرے اور دائماً حالتِ ذکر میں رہے۔ پروردگارِ عالمین، ربِّ کریم کی نظر میں نفسِ انسانی کے لیے غفلت اور حقیقت سے عدم توجہی کا مسئلہ اِس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اِس حوالے سے سخت تنبیہ وارد ہوئی ہے۔ ہم اختصار لیکن جامعیّت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ذیل میں کلامِ مجید کی فقط دو آیتوں کی مدد سے مذکورہ مطلب کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ **سورۃ حشر آیت نمبر ۱۹** میں اللہ مومنین کو حکم دیتا ہے کہ:

وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ.

معنی یہ ہیں کہ مومنین کے لیے لازمی ہے کہ ان لوگوں جیسے نہ ہوجائیں جنہوں نے یادِ خدا کو طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا۔ پس (اس بھول کے نتیجے میں) وہ ایسے ہوگئے کہ اپنے آپ کو ہی بھول گئے یعنی اپنے نفوس کو فراموش کر بیٹھے۔ اس آیت میں لفظ نسیان (نَسُوا اللّٰہ) پر خصوصیت کے ساتھ غور فرمائیں۔ **نسیان** یعنی یاد کر کے بھول جانا۔

دوسرا مقام **سورۃ اعراف** کی آیت نمبر ۲۰۵ ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ:

''وَاذْکُرْ رَبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ

الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ."

ترجمہ: "اور ذکر کر اپنے رب کا اپنے نفس میں گریہ وزاری اور خوف کے ساتھ، (یہ ذکر خفیہ انداز سے ہو) اور زور دار آواز میں بول کر نہیں' صبح اور شام کے اوقات میں' اور (دھیان رکھنا) کہ تم غافلین میں سے نہ ہو جانا۔"

ہم نے خصوصیت سے ترجمہ اس لیے نقل کیا تا کہ آیت کا عجیب اور اصولی اندازِ بیان کھل کر سامنے آ جائے۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم زبان سے اسمائے الٰہیہ اور دیگر اوراد و وظائف کے دُہرانے' قرآن کی تلاوت کرنے اور دعا و مناجات پڑھنے کو ذکر سمجھتے ہیں لیکن آیت صراحت کے ساتھ بیان کر رہی ہے کہ ذکر کا محل اور مقام نفسِ انسان ہے زبان نہیں' اور اس امر کو سمجھانے کے واسطے یہ تاکید بھی موجود ہے کہ " **دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ** "یعنی بلند آواز سے کہہ کر نہیں بلکہ عاجزی اور گڑگڑا کر اپنے نفس میں اللہ کا ذکر کرو اور جو یہ کام نہیں کرتا وہ حقیقت میں غافل ہے۔ عاجزی اور خوف کی تاکید بھی بہت قابل غور ہے کیونکہ جب تک نفس اللہ کی بارگاہ میں اپنی بے چارگی کے اعتراف کے ساتھ حاضر نہ ہو اور اللہ ہی کی جانب سے اپنی تمام حاجات کے پورا ہونے کی امید نہ رکھے، اُس کے شرک میں مبتلا ہونے کے امکانات بہت زیادہ موجود رہتے ہیں۔

دونوں آیتوں کو ملا کر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نفسِ انسانی کے لئے سب سے بڑی مصیبت نسیان اور غفلت ہے۔ اس خرابی سے نجات حاصل کرنے کے لئے واجب ہے کہ انسان متذکر ہو یا حالتِ ذکر میں رہے۔ ذکر کا مطلب اللہ کی یاد کو اپنے نفس میں محفوظ رکھنا ہے جس کا ایک "مظاہرہ" زبان سے قرائت و تلاوت ہے نہ کہ زبان سے قرآن و دعا پڑھنے کا مطلب ذکر ہے۔ نفس اگر ذاکر نہ ہو تو اس کا شمار غافلوں میں کیا جائے گا۔ یادِ حق نفس میں اُسی وقت محفوظ رکھی جا سکتی ہے جب انسان حق کی جانب متوجہ اور روحانی طور پر بیدار ہو۔ اور اگر خدانخواستہ انسان کو دنیا اور شیطان اپنی طرف متوجہ کر لیں تو وہ حالتِ نسیان میں چلا جائے گا جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہو گا کہ وہ خود اپنی حقیقت کو اور اپنے نفس کو بھلا بیٹھے گا اور جو خود اپنے آپ سے غافل ہو جائے وہ کیونکر اپنے آپ کو دشمن کی چالوں سے اور پھیلائے ہوئے جال سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ایسا انسان جسے شیطان اور نفس امّارہ شکار کر لیں حتماً تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائے گا اور ایسے نفس کے لیے کبھی بھی فلاح یافتہ ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

یہ دو آیتیں نفس کی صلاح، فلاح، صحت اور بیماری کے حوالے سے کلیدی معارف کی حامل ہیں۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو اپنے نفس کے امور سے دلچسپی رکھتا ہے ان آیتوں میں بیان کردہ مطالب کو لازماً حفظ اور احصا کر لے۔

معرفتِ نفس از روئے قرآن

جیسا کہ نفس کے بارے میں مشہور ترین حدیث یا جملے **"من عرف نفسه فقد عرف ربه"** میں معرفت کا مرکز نفسِ انسان کو قرار دیا گیا ہے۔ جو نفس خود اپنی معرفت سے بہرہ مند ہو جاتا ہے وہ بلا ریب و تردید معرفتِ رَبّ کو حاصل کر لیتا ہے اور اس امر کو بھی پوشیدہ نہیں رہنا چاہئے کہ رَبّ کی حاصل شدہ معرفت بھی نفس کے آئینہ میں ہی متجلی ہو گی۔ بالکل اسی طرح قرآنِ کریم نے بھی حیاتِ دنیوی اور اُخروی میں پیش آنے والے تمام اہم واقعات کا مخاطب اور مرکز نفس کو ہی بتلایا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام موارد میں کہیں بھی جسم یا روح کا تذکرہ نہیں ہے۔ بہتر یہی محسوس ہوتا ہے کہ موضوعاتی انداز سے اور نکتہ وار قرآن میں نفس کے ذکر کو بیان کیا جائے تا کہ نفسِ انسان کے حوالے سے قرآن کی فکر واضح اور بیّن ہو جائے۔ **و الله المستعان.**

(۱)احوالِ نفس پر متوجہ اور نگراں رہنا ہر صاحبِ ایمان پر واجب ہے۔ **سورہ مائدہ آیت ۱۰۵** میں ارشاد ہوتا ہے:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ."

اس آیت کا متن عقل کو حیرت میں ڈالنے اور مبہوت کر دینے والا ہے۔ اگر لفظی ترجمہ کیا جائے تو یوں ہوگا کہ: ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر لازم ہیں تمہارے (اپنے) نفوس۔ جو گمراہ ہے وہ تم کو ضرر (نقصان) نہیں پہنچا سکتا' جبکہ تم ہدایت یافتہ ہو۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔ پس وہ تمہیں خبر دے گا جو کچھ کہ تم عمل کرتے رہے ہو'' سب سے اہم بات جو فکر کو چوکنّا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں پر خطاب مومنین سے ہو رہا ہے اور یہ ہدایات فقط اہلِ ایمان کو کی جا رہی ہیں کہ تم پر اپنے نفوس کی نگرانی لازم ہے۔ یہاں **"ایھا الناس"** نہیں ہے یعنی تمام انسانوں کو مخاطب نہیں کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صرف صاحبان ایمان پر کیوں لازم قرار دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے نفس پر نگراں رہیں؟ اس لیے کہ وہ ہدایت حاصل کر لیں۔ کس چیز کی ہدایت؟ اللہ تک لے جانے والے راستہ کی ہدایت؛ مگر وہ راستہ کیا ہے؟ خود مومن کا نفس! العجب! اللہ سمجھا رہا ہے کہ راہِ ہدایت خود مومن کے وجود کے اندر پائی جاتی ہے۔ لہٰذا عالمِ خارج میں چاہے کوئی کتنا ہی گمراہ کیوں نہ ہو اُس کی ضلالت اور گمراہی مومن کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

اگر آیت کا مطلب واضح اور روشن ہو رہا ہے تو ہم سورۂ الحمد میں ''**صراط مستقیم**'' کی تشریح میں بیان کردہ جملے **"صراط الذین انعمت علیھم"** کے مطلب کو بھی بخوبی درک کر سکتے ہیں۔ یعنی صراط مستقیم حقیقتاً وہ انسان ہیں جو اللہ کی بارگاہ سے انعام یافتہ ہیں۔ صراط مستقیم کوئی سڑک یا شاہراہ نہیں ہے' بلکہ یہ وہ راہ ہے جو بغیر شک و تردد کے خدا تک پہنچاتی ہے اور اُن حضرات کے نفوس سے عبارت ہے جنہیں اللہ نے اپنا بنایا ہے۔ بطورِ نمونہ وہ فقرے ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں جو اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے ارشاد فرمائے کہ **"انا اخترتک"** اور **" واصطنعتک لنفسی"** (**سورۃ طٰہٰ. آیات ۱۳ اور ۴۱**) یعنی میں نے تجھ کو اختیار کر لیا اور اپنے نفس کے لئے پروان چڑھایا۔ پس صراطِ مستقیم سے وابستہ ہونا اور اِس راہ کو طے کرنا درحقیقت اپنے نفس کو اِن انسانہائے کامل کے نفوسِ مطہرہ سے مربوط اور منسلک کر دینے کا نام ہے، اور یہی ولایت و امامت کا حقیقی معنی ہے۔ لہٰذا ہر مومن پر لازم ہے کہ وہ کامل توجہ کے ساتھ نگراں رہے کہ اُس کا نفس' نعماتِ الٰہیہ کے حامل انسانوں کے نفوس سے کس درجہ مطابقت اور مماثلت رکھتا ہے۔ یہ شناسائی جتنی شدید ہوگی اتنا ہی مومن راہِ ہدایت پر پیش قدمی کرتے ہوئے اللہ سے نزدیک تر ہوگا۔ کیونکہ وہ انسان جو حق پر ایمان نہیں رکھتا اُس کا نفس صاحبانِ **"انعمت علیھم"** کے نفوس سے غافل اور لاتعلق ہوتا ہے لہٰذا اِس قابل بھی نہیں ہوتا کہ ایسے نفس کو طریقِ ہدایت یا راہِ ہدایت قرار دیا جا سکے۔ عقدِ ولایت کا قیام' نفس کے احوال پر نگراں رہنے کا اہم ترین مورد ہے۔

اپنے نفس کے احوال اور امور پر متوجہ رہنے کی اہمیت کو مزید اجاگر کرنے کے لیے ہم **سورۂ بقرہ کی آیت ۴۴** کی طرف بھی رجوع کر سکتے ہیں' جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: **اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ .** جس کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا تم انسانوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو (مگر) اپنے نفوس کو فراموش کر دیتے ہو؟ یہ وہ مسئلہ ہے جو ہمارے درمیان عام طور سے پایا جاتا ہے۔ ہماری اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جو دوسروں کی اصلاح کے بارے میں تو بہت فکرمند رہتے ہیں اس فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ معاشرہ کو کیسے سدھارا جائے لیکن خود اپنے نفس کی صحت اور بیماری کے امور سے غافل ہیں۔ جبکہ حقیقتاً ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ

وہ اپنے نفس کی تربیت کو اپنی اوّلین ذمے داری سمجھے اور اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ بندگانِ خدا کی بہتری اور تربیت کا بھی وسیلہ بنتا رہے۔

(۲) اپنے آپ میں تفکر نفس کو غفلت سے نجات دلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ نفسِ انسانی شاید وہ واحد مخلوق ہے جو اپنے بارے میں آگاہ ہے اور اپنے آپ پر غور وفکر کی صلاحیت سے مجہز اور مسلح ہے۔ ہم نے لفظ مسلح کیوں استعمال کیا؟ اس لئے کہ شیطانی اثرات اسے ہر وقت غفلت کی نیند سلا دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے نفس کے پاس اسلحہ موجود اور آمادہ ہے۔ یہ اسلحہ ''تفکر'' ہے۔ اپنے نفس میں تفکر ہی سبب بنتا ہے کہ انسان آیاتِ حق کو پہچان سکے اور اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے کما حقہ تیاری کر سکے۔ سورۂ روم کی آیت نمبر ۷ اور ۸ سے یہ اور دیگر مطالب اخذ کیے جا سکتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

"يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ. اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ."

آیت کے مفاہیم کچھ یوں ہیں کہ: عام انسانوں کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ دنیوی حیات کے ظاہری پہلو یعنی زیب وزینت اور مادّی لذّات وشہوات پر فریفتہ اور دلباختہ ہوتے ہیں۔ یہ رَویہ ان کے لیے دنیا کے باطن یعنی آخرت میں داخل ہونے کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اِس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس بیماری کا علاج کیا ہے؟ نفس کس طرح غفلت کے موذی مرض سے نجات حاصل کرے؟ آیۂ کریمہ بطور حل یہ نسخۂ کیمیا عطا کر رہی ہے کہ: ''یہ انسان اپنے نفوس میں تفکر کیوں نہیں کرتے۔'' اگر یہ نفس کے امور میں تفکر کریں تو معارفِ حقّہ کی تین جہات سے روشناس ہو جائیں گے جس کا لازمی نتیجہ غفلت سے نجات کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ پہلی معرفت یہ کہ نظامِ خلقت مقصد اور ہدف رکھتا ہے اور جو کچھ اللہ نے سماوات وارض میں تخلیق فرمایا ہے اُس میں سے ایک شئ بھی لا یعنی اور عبث نہیں ہے، بلکہ سب کی سب آیاتِ حق ہیں۔ دوسرا یہ کہ نظامِ مادّی ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے، بلکہ اس کے واسطے ایک مدتِ معین ہے جس سے تجاوز ناممکن ہے، پس اپنے لئے سامان مہیا کرنے کا موقع بھی محدود ہے اور تیسری جہت معرفت یہ کہ زندگی کے اس سفر میں نفس ایک مرحلے پر اپنے رب کے روبرو آئے گا اور اس سے ملاقات ایک اٹل حقیقت ہے جس سے مفر ممکن نہیں ہے۔ تو کیا غفلت کے ساتھ رب کی ملاقات مفید ثابت ہو سکے گی؟

۳) موت، آخرت، سزا و جزا اور حساب کتاب کا محور و مخاطب نفسِ انسان ہے۔ قرآنِ کریم کے مطالعے کے بعد یہ اہم ترین مطلب خصوصی طور پر واضح ہوتا ہے کہ وہ تمام امور جن کا تعلق خالصتاً انسان کی ذات سے ہے ان تمام مقامات پر قرآنِ کریم نے بلا شرکتِ غیرے لفظ 'نفس' استعمال کیا ہے، یعنی یہ کہ کہیں پر بھی جسم یا روح کا حوالہ نہیں ہے۔ اس فرق کو ہم انشاء اللہ آئندہ ابواب میں واضح کریں گے۔ فی الحال ہم ان قرآنی آیات کو پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ سیرِ زندگانی کے تمام مراحل میں انسان کے وجود کی نمائندگی اس کا نفس ہی کرتا ہے۔ کیونکہ یہ نکتہ تفصیلی ہے لہذا اسے ہم تین علیحدہ نکات کے ذریعہ واضح کریں گے۔

(۳.۱) 'تکلیف' اور 'کسب' دونوں نفس کے لیے ہیں: یہاں پر تکلیف سے مراد وہ ذمے داری ہے جس کا حساب دینا پڑے گا اور اس قسم کی ذمے داری کو دینی اصطلاح میں تکلیفِ شرعی بھی کہا جاتا

ہے۔لہٰذاانسان کی وہ وجودی حقیقت جو اپنے اعمال، کردار اور نیتوں کی ذمے دار اور جواب دہ ہے اُس حقیقت کا نام نفسِ انسان ہے۔ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۸۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا لَھَا مَا کَسَبَتْ وَ عَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ. ترجمہ: اللہ نہیں تکلیف دیتا (ذمّہ داری ڈالتا) کسی بھی نفس کو مگر اُس کی وُسعت کے مطابق۔ جو کچھ نفس نے کَسب کیا (کمایا) وہی اُس کے لئے اور اُس کے اوپر ہے (یعنی نفس اپنی کمائی میں گروی ہے)۔

یعنی یہ نفس ہے جو خدا کی بارگاہ میں مکلّف ہے اور نفس ہی ہے جو کسب کرتا یعنی کماتا ہے اور اپنے جاودانی مستقبل کے لیے سامانِ حیات فراہم کرتا ہے اور اپنے اعمال کا ذمے دار ہے۔ اسی طریقے سے سورۂ مدثر کی آیت نمبر ۳۸ میں ارشاد ہوتا ہے: ''**کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ .**'' یعنی ہر نفس گروی ہے اور مرہونِ منت ہے اس کمائی کا جو اس نے اس دنیا کی زندگی میں حاصل کی۔ یہ کمائی نفس کی فکر، عقل اور اعمال پر مشتمل ہے۔

(۲ ۳) اجل توفی اور موتِ نفس کے لیے ہیں: انسان کی دُنیوی زندگی محدود اور معین ہے: "**ولن یوخر اللہ نفسا اذا جاء اجلھا** (سورۂ مفافقون ۶۳۔آیت ۱۱) **ترجمہ:** اور اللہ ہرگز مُوخر کرنے والا (مہلت دینے والا) نہیں ہے کسی بھی نفس کو، جب اس نفس کی اَجَل آجائے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ نے اس امر کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ ہر انسان یعنی نفس کے لیے ایک معینہ مدت ہے جس سے نہ آگے بڑھا جاسکتا ہے نہ اس مدت کو پیچھے لایا جاسکتا ہے۔ اس حقیقت کو کہیں قرآن نے اجل اور کہیں اجلِ مسمّی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام کی دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''**ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ .**'' جس کا معنی یوں ہے کہ اللہ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے خلق کیا پھر تمہارے لئے اجل قرار دی اور اجلِ مُسمّیٰ اللہ کے پاس ہے۔

زندگی کی مدت کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن اس حقیقت کو بھی صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ ہر نفس اپنی دنیوی حیات کی مدت پوری کرنے کے بعد اس عالم سے ایک اور عالم میں منتقل ہوجائے گا۔ اس مرحلے کو زبانِ قرآن میں "**توفّی**" کہا گیا اور اسی چیز کو ہم اپنی زبان میں انتقال کہتے ہیں۔ سورۂ سجدہ کی آیت ۱۱ اور سورۂ زمر کی آیت ۴۲ کے مطالعہ سے نفسِ انسان کے **متوفی** (دنیا سے آخرت میں منتقل) ہونے کے بارے میں واضح اعلان نظر آتا ہے۔ یعنی یہ وہ قضائے الٰہی ہے جس سے کسی نفس کے لیے فرار کا موقع میسّر نہیں ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جو شئے اگلے عالم میں منتقل ہوتی ہے وہ انسان کا جسم نہیں ہے بلکہ جسم جس مقام سے اٹھا تھا (یعنی خاک سے) وہیں واپس چلا جاتا ہے اور انسان کے وجود کی حقیقت یعنی اس کا نفس عالمِ مادّیت سے برزخ اور بعد ازآں آخرت میں منتقل ہوجاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے نفسِ انسان کے لیے ایک حیرت انگیز مرحلے کا تذکرہ کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر نفس اپنی زندگی کے ایک لمحے میں ''موت کا ذائقہ'' چکھے گا۔ "**کُلُّ نَفْسٍ ذائقۃ الموت**" (سورۂ آل عمران ۳۔آیت ۱۸۵) زیادہ تر انسانوں یا نفوس کے لیے موت کے ذائقہ کا چکھنا انتقال کے وقت ہی ممکن ہوتا ہے، لیکن غور فرمائیں کہ آیت کا یہ بیان نہیں ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھایا جائے گا' بلکہ ارشاد یوں ہے کہ: ''ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے گا۔'' یعنی موت کی نسبت سے نفس فاعل ہے مفعول نہیں۔ شاید اِسی نکتے کی بنیاد پر اولیاء اور عرفا موت کو جبری نہیں بلکہ اختیاری شئے سمجھتے ہیں۔ یعنی نفس جب چاہے اپنے کو اِس قابل بنالے کہ موت کا ذائقہ چکھے اور دارِ فنا سے دارِ بقا میں داخل ہوجائے، چاہے جسمِ مادّی ساتھ ہو یا نہ ہو۔

موت کی حقیقت کے بارے میں بحث ہمارے احاطۂ بیان سے باہر ہے، لیکن یہاں صرف اتنا کہتے چلیں کہ موت وہ حقیقت ہے جس کا سامنا ہر نفس کو کرنا ہے، جس کا گھونٹ ہر نفس کو

لینا ہے' لیکن موت کا ذائقہ چکھنے کے بعد کے نتائج نفس کی اپنی حالت پر منحصر ہوتے ہیں۔ اگر نفس صفات میں پاکیزہ اور ظلم ورذالت سے دور ہے' تو وہ موت کے وسیلے سے فنا وضعیفی کے تمام اثرات کو جھاڑ کر ابدی اور باقی ہو جاتا ہے اور ہمیشہ رہنے والی زندگی اور اس کی دائمی نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر خدانخواستہ نفس دنیا کی زندگی میں اپنے اندر صفاتِ حسنہ پیدا نہ کر سکا، اگر معاذ اللہ وقتِ توفّی نفس شقی اور بدبخت ہے' تو موت کا ذائقہ اس کے لیے ابدی اذیتیں اور باقی رہنے والی تکلیفیں لے کر آتا ہے۔ بہرحال انجامِ کار کچھ بھی ہو، ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ نفسِ انسان ہی موت کا ذائقہ چکھنے والا اور اس کے بعد کے اثرات کو حمل اور احصا کرنے کا مورد ہے۔

(۳.۳) عالمِ مادّیت یا دنیا سے رخصت ہونے کے بعد چاہے وہ نامۂ اعمال کا کھولا جانا ہو یا میدانِ حشر میں باریابی کا مرحلہ ہو' ہر مقام پر قرآنِ کریم نے حقیقتِ انسان کو نفس کے نام سے ہی یاد فرمایا ہے۔ اس موضوع کے ذیل میں مزید کئی نکات پیشِ نظر ہیں جن کو آنے والی سطور میں پیش کیا جا رہا ہے۔ قارئین سے خصوصی توجہ کی گذارش ہے۔

(الف) روزِ قیامت ہر نفس اپنے اعمال کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائے گا چاہے وہ اعمال نیک ہوں یا بد: **یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَ بَیْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِیْدًا وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ** (سورۂ آلِ عمران۳۔ آیت۳۰) آیت مبارکہ کے ترجمہ سے جو مطلب واضح ہوتا ہے وہ یہ کہ قیامت کے یوم میں ہر نفس اپنے ہر عمل کو، خواہ نیک ہو یا بد، اپنے سامنے حاضر اور موجود پائے گا۔ اور جس کے اعمال مبنی بر سوء ہوں گے وہ یہ تمنا کر رہا ہوگا کہ کاش میرے اور میرے اعمال کے درمیان مُدّتوں کا فاصلہ ہوتا۔

(ب) یہ انسان کا نفس ہی ہے جسے اس کا اعمال نامہ اور دنیوی زندگی کی کمائی بلاکم وکاست سونپ دی جائے گی۔ لفظ **تُوَفّٰی** یعنی بغیر کسی کمی یا زیادتی کے:

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (سورۂ بقرہ۲۔ آیت۲۸۱) ترجمہ: اور بچاؤ اپنے آپ کو اُس یوم سے جس میں تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور پھر ہر نفس کو بلاکم وزیاد، وہ سب کچھ حوالے کر دیا جائے گا جو اس نے کمایا تھا اور اُن (نفوس) پر (ذرہ برابر) ظلم نہیں کیا جائے گا۔

وَ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (سورۂ آلِ عمران۳۔ آیت۱۶۱) اس آیت کے آخر میں بھی پچھلی آیت کے آخری جملے کا اعادہ ہے جہاں یہ بیان ہوا کہ ہر نفس کو اُس کی کمائی بغیر کسی کمی اور زیادتی کے سونپ دی جائی گی اور کسی نفس پر اس حوالے سے قطعاً کوئی ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔

(ج) اپنی کتاب یعنی نامۂ عمل کا پڑھنا اور مقامِ حساب میں وارد ہونا نفس ہی کے لیے ہے۔

اِقْرَاْ کِتٰبَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا (سورۂ بنی اسرائیل۱۷۔ آیت۱۴) ترجمہ: پڑھ اپنی کتاب (نامۂ اعمال) کافی ہے آج کے یوم ہر نفس خود اپنا حساب لینے کے لئے۔

(د) میدانِ حشر میں بھی حاضری دینے والا نفسِ انسان ہی ہے لیکن اس شان کے ساتھ کہ اس کو ایک لے چلنے والا (**سائق**) اور کوئی اُس پر (اللہ کی جانب سے) گواہ ہوگا (**شهید**)۔

وَ جَآءَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِیْدٌ (سورۂ ق۵۰۔ آیت۲۱)

(ھ) اور یہ نفسِ انسان ہی ہے جو اپنی نیت' کردار اور اعمال کی کماحقہ جزا کو بارگاہِ خداوندی سے حاصل کرے گا:

لِیَجْزِیَ اللّٰهُ کُلَّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (سورۂ ابراہیم۱۴۔ آیت۵۱) جس کا ترجمہ ہے کہ: تاکہ وہ (اللہ) جزا دے ہر نفس کو، جو کچھ اس نے کسب کیا ہے اور بے شک اللہ حساب لینے میں بہت سُرْعت والا ہے یعنی احتساب میں ہرگز کمزوری اور سستی نہیں دکھاتا۔

مذکورہ بالا آیات اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ انسان کا نفس ہی اس کے وجود کی اصلیت کا نمائندہ ہے اور اس کی نیتوں اور اعمال کے آثار و نتائج کا محافظ بھی۔ لہٰذا اگر کوئی یہ نظریہ رکھتا ہے کہ اِس دنیا سے انتقال کے بعد نفس روح بن جاتا ہے یا نفس اور روح ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، تو اُسے اُن آیات کو مدِنظر رکھنا چاہیے جو آخرت اور قیامت کے کسی مرحلے پر بھی وجودِ انسانی کو روح سے تعبیر نہیں کرتیں۔

نفس کی مختلف حالتیں اور اُن کے درجات

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر نفس کے ساتھ کئی لاحقے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ۔ نفس کو ان مختلف ناموں سے یاد کرنے کا مقصد یہ بتانا نہیں ہے کہ نفسِ انسانی کی مختلف اقسام ہیں، بلکہ اِس طرزِ تذکّر کا مقصد نفس کی مختلف حالتوں یا درجات سے روشناس کرانا ہے۔ قِسم اور حالت کے فرق کو مدنظر رکھنے میں اصل نکتہ یہ ہے کہ ایک قسم (type) دوسری قِسم میں تبدیل نہیں ہوتی لیکن ایک حالت بدل کر نئی حالت میں اپنے آپ کو ظاہر کرسکتی ہے۔ جیسے تیل، پانی اور پارہ مائع اشیاء کی اقسام ہیں لیکن برف، پانی اور بھاپ؛ ایک ہی شے کی تین حالتیں ہیں نہ کہ اقسام۔

یہ Concept بہت اہم ہے اور اس کا سمجھنا اور درست تشخیص، معرفتِ نفس کے حوالے سے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس اہمیت کے پیشِ نظر اور بنیادی فکر کا اعادہ کرتے ہوئے ہمارا یوں سمجھنا درست نہیں ہے کہ اولیائے خدا کے پاس کسی اور قسم (Category) کا نفس ہے اور فاسق و فاجر انسانوں کے وجود میں کسی اور قسم کا نفس پایا جاتا ہے۔ بلکہ درحقیقت دونوں کے نفوس کی حالتیں (Conditions) مختلف ہیں جس کی وجہ سے درجات کا تفاوت پیدا ہوتا ہے اور یہ درجات کا ہی فرق ہے جس کے سبب ایک نفس اعلیٰ اور ایک پست و کمینہ نظر آتا ہے۔ یہاں پر حالتوں سے مراد نفس میں موجود مَلِکات ہیں۔ اس استدلال کا ثبوت یہ ہے کہ جیسے ہی ایک فاسق و فاجر انسان حق اور سچائی کی جانب متوجہ ہوتا ہے، پُرخلوص توبہ کرتا ہے تو فوراً ہی اللہ کی جانب سے ہدایت کو حاصل کرلیتا ہے جس کی بنا پر نفس کی حالت میں مثبت تغیر رونما ہونے لگتا ہے۔ ترقی کرتے ہوئے اور تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے نفس لئے یہاں تک ممکن ہے کہ کچھ ہی عرصے میں اس کا شمار بھی اولیائے الٰہی میں ہونے لگے۔

قرآنِ کریم میں اس کی بہترین مثال ان جادوگروں کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے تھے اور انتہائی مختصر وقت میں اُن کے نفوس نے حیرت انگیز ترقی کے مراحل طے کر لئے بطور حوالہ اس واقعہ کے لئے سورۂ اعراف کی آیات ۱۱۳ تا ۱۲۵ کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صوفیا کے حالات میں ایک عمدہ مثال فضیل بن عیاض کی ہے جو سورۂ حدید کی آیت کے وسیلے سے منقلب ہوا اور حالتِ فسق و فجور سے بلند ہوکر بزرگانِ دین کے زمرے میں شامل ہوا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو داستانِ راستان۔ شہید مرتضیٰ مطہری)

یہ واقعات اور دیگر امثال اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ نفسِ انسانی کا بنیادی جوہر ایک ہی ہے، یعنی فطرتِ الٰہیہ۔ جو نفس اس جوہر کی مناسب پرورش اور تربیت کرتا ہے وہ بلند درجات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ نفس جو اِس جوہر کو غفلت اور جہالت کی تاریکیوں کے سپرد کرتا ہے وہ اپنے مقام سے نیچے گر کر حیوانیت اور شیطنت کے فتنوں کا اسیر بن جاتا ہے۔ اور یہ سفر خواہ اعلیٰ علیّین کی جانب ہو یا اسفل السّافلین کی طرف، اس کا مسافر ایک ہی ہے یعنی نفسِ انسان، جس کی حالتیں تو شاید لامحدود ہیں لیکن قسم ایک ہی ہے۔

اِس کلیدی اور بنیادی نکتے کے واضح ہونے کے بعد اب مناسب یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی آیتوں کی روشنی میں نفس کی مختلف حالتوں کو بیان کر دیا جائے تاکہ موضوع مکمل ہوجائے۔ آیاتِ قرآنی کی رو سے ابتدائے خلقت میں نفس Zero state پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس حالت میں وہ صرف ایک استعداد اور صلاحیت کا حامل ہوتا ہے اور فطری ہدایت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ لیکن ایامِ

حیات کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اختیار کی بنا پر نفس مثبت یا منفی سمت کی جانب پیش قدمی شروع کر دیتا ہے اور اس سیرِ اختیاری کی بنا پر اس کی حالت اصل یا پیدائشی حالت سے تبدیل اور متغیر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ نفس کی اس تبدیلیٔ احوال کو جو عروج یا سقوط پر مبنی ہوتی ہے قرآن نے مختلف اصطلاحات سے یاد کیا ہے۔ اب ہم نفس میں رونما ہونے والے ان تغیرات کا بیان کرنا پسند کریں گے جنہیں زبانِ وحی نے نفس کی مختلف حالتوں کے ذیل میں ذکر فرمایا ہے۔

(۱) **نفس ملھمہ**: سورۂ والشّمس کی آیت ۷ اور ۸ میں ارشاد ہوتا ہے: **"ونفس و ما سوھا فالھمھا فجورھا و تقوٰھا" ترجمہ: اور قَسَم نفس کی اور اُس کی (یعنی اللہ) جس نے اسے (نفس کو) درست اور معتدل کیا اور پھر (خود نفس کو) اُس کے فجور اور تقویٰ کا الھام عنایت فرمایا** ۔اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات کا اسلوبِ بیان حیرت انگیز ہے جن میں اللہ سبحانہ نے گیارہ قسمیں کھائی ہیں اور ان میں سب سے آخری **قَسَم** نفس کی ہے اور اُس ہستی کی جس نے اس نفس کو درست اور استوار کیا ہے یعنی احسن الخالقین خود۔ شاید اس اندازِ بیان سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہو کہ نفسِ انسان کا اپنی تمام تر صفات و جہات کے ساتھ پیدا کرنا تخلیقات کا کمال اور نچوڑ ہے اور وہ ہستی جس نے اس نفس کو خلق فرمایا اس کے حسنِ تخلیق کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

بہرحال خالقِ کل کے ارشاد کے مطابق نفس خلق ہوا' استوار کیا گیا اور اُسے ایسی حالت میں ٹھہرایا گیا کہ وہ "**سویہ**" یعنی معتدل ہے۔ یعنی وقتِ پیدائش نہ اچھا ہے نہ برا، نہ جنتی ہے نہ جہنمی بلکہ زندگی کی دوڑ میں ابتدائی لکیر (Starting line) پر کھڑا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ زندگی کا یہ سفر عمودی (Vertical) ہے نہ کہ اُفقی (Horizontal)۔ یہ نفس یا تو اوج و عروج کی جانب سفر کرے گا یا جہالت و حماقت کی کھائیوں میں گرے گا۔ اپنی زندگی میں یا تو بلندیٔ درجات کا حامل ہوگا یا پستیٔ درکات سے دوچار ہوگا۔

قرآن کریم کی اصطلاح "الھام شدہ نفس" ہمیں ایک اہم ترین حقیقت سے آگہی عطا کرتی ہے۔ نفس کی خلقت کے مرحلے پر سب سے اہم سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے' وہ یہ ہے کہ کیا نفس ایک خالی برتن یا سادہ صفحے کی مانند ہے کہ جس میں جو چاہے بھر دیا جائے؟ تو سورۃ والشّمس سے جواب آتا ہے کہ 'ہرگز نہیں، بلکہ یہ نفس جو ابھی ابھی خلق اور درست ہوا ہے **الھام شدہ** ہے'۔ کس چیز کا الھام، جسے لے کر نفس پیدا ہو رہا ہے؟ اچھائی اور برائی کا الھام۔ ذاتی فسق و فجور اور تقویٰ و پاکیزگی کی معرفت کے لحاظ سے نفس "ملھم" ہے۔ یعنی وہ تمام امور جو نفس کے ارتقا کا سبب ہو سکتے ہیں اور وہ تمام خرابیاں جو نفس کے سقوط کا وسیلہ بن سکتی ہیں، بصورتِ الھام نفس کے خمیر میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ یہ وہی الھام ہے جس کو دوسرے مقام پر قرآنِ کریم نے فطرت سے تعبیر کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس الھام کو ہدایتِ فطری بھی کہا جا سکتا ہے اور یہی الھام سورۂ دھر میں ہدایتِ راہ (**اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْل**) کے عنوان میں بھی شامل اور موجود ہے۔

لہٰذا مقامِ اوّل پر جس سچائی کا ذہن نشین کر لینا لازمی اور ضروری ہے' وہ یہ کہ نفسِ انسان رب العالمین کی تخلیقات کا ماحصل اور شاہکار ہے اور ابتدائے خلقت میں بھی خالی (Blank) نہیں بلکہ **مُلْھِم** ہوتا ہے یعنی اللہ کی مہربانی اور اُس کے لطف کے سبب ان تمام ہدایتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے جو نفس کی پاکیزگی اور ارتقا یا اس کی پستی اور گراوٹ سے متعلق ہوں۔

یہاں اس بات پر بھی اچھی طرح غور فرمالیجیے کہ خدائے تعالیٰ کا ارشاد یوں نہیں ہے کہ نفس حقائقِ کائنات کا عالم ہو کر اور معارفِ حیات کا حامل ہو کر پیدا ہوتا ہے' بلکہ بیان یوں ہے کہ نفس اپنی خلقت کے موقع پر ان تمام ادراکات کا حامل ہوتا ہے' ان تمام امور کو اچھے طریقے سے پہچاننے اور شناخت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جن کا تعلق اس کی ذاتی بھلائی اور خرابی سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر انسان سچ' محبت' اور ایثار کو خیر اور جھوٹ' ظلم اور غصب کو شر سمجھتا ہے۔ تا اینکہ شیاطینِ جن وانس کے پھندے میں پھنس کر الھام شدہ فطری ہدایت کو ضائع کر دے۔

۲) **نفسِ امّارہ:** نفسِ انسان جب دنیائے رنگ و بو میں اپنے سفرِ زندگانی کا آغاز کرتا ہے تو اس کے سامنے دو واضح راستے موجود ہوتے ہیں۔ ایک اوپر اور بلندی کی جانب جس میں درجات' رفعتیں اور فضیلتیں پائی جاتی ہیں اور دوسرا نیچے کی طرف جس میں پستی' گراوٹ' سقوط اور درکات ملتے ہیں۔ نفس کے پاس ان دو میں سے ایک راستے کا انتخاب کرنے کے لیے سو فیصد اختیار موجود ہے اور اس حوالے سے اس پر ذرّہ برابر جبر' کراہیت اور دباؤ نہیں ہے جیسا کہ آیاتِ قرآنی میں برملا اعلان موجود ہے کہ (**لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ**) (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶) اور'' **اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا**۔

اگر خدانخواستہ نفسِ ملھمہ اپنے جسم میں موجود حیوانی رجحانات کے دباؤ میں آ کر یا اپنی اِنیّت و انانیت (خود بینی و خود پسندی) کے فریب میں مبتلا ہو کر یا بدترین صورتحال میں شیطان کے دامِ ہوا و ہوس میں گرفتار ہو کر زندگی کے سفر پر روانہ ہوئی تو اُس کا رخ نیچے کی طرف ہوگا نہ کہ بلندیوں اور رفعتوں کی جانب۔ وہ شر کی راہوں کو طے کرے گا نہ کہ خیر و برکت کے راستوں کا مسافر ہوگا اور ایسی صورت میں نفسِ ملھمہ، الہام شدہ حقائق کو فراموش کر دے گا اور اس کی حالت تبدیل ہو کر نفسِ امّارہ میں بدل جائے گی۔ نفسِ امارۃ'' بالسّوء یعنی ایسا نفس جو پستیوں میں داخل ہونے کا اَمر یا حکم دیتا رہے۔

سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۵۳ میں خود حضرت یوسفؑ کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہوتا ہے کہ: ''**اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ**.'' **ترجمہ: بے شک نفس برائی کا امر کرتا ھے مگر یہ کہ میرا رب رحم کرے اور یقیناً میرا رب غفور و رحیم ھے.**

سورۃ یوسفؑ کی بیان کردہ آیت میں ''معرفتِ نفسِ امّارہ'' کے حوالے سے چند انتہائی اہم نکات پوشیدہ ہیں جنہیں ہم بتائیدِ خداوندی نکتہ وار اور بالتفصیل بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(الف) اگر نفس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے' یعنی اس کی دینی تربیت نہ ہو' اس کے تزکیے پر محنت نہ کی جائے تو نفس خود بخود **ملھمہ** سے ''**امارۃ بالسوء**'' بن جاتا ہے۔ **امارۃ بالسوء** یعنی بُرائی کا امر کرنے والا، بدی کا حکم دینے والا۔ معرفتِ نفس کے حوالے سے یہ پہلو واقعاً خوفزدہ کر دینے والا ہے اور مومنین سے مسلسل مراقبہ اور محاسبہ کا طلبگار رہے۔

(ب) نفس، **امّارۃ بالسّوء** کی حالت میں کیوں چلا جاتا ہے؟ اس لیے کہ ایک عام انسان کا نفس اپنی پیدائش کے وقت حیوانی جبلّتوں' مادّی تقاضوں اور جسمانی خواہشات سے نزدیک تر ہوتا ہے' بہ نسبت عقلی اور روحانی ادراکات کے۔ لہٰذا اگرچہ کہ نفس اپنے خیر و شر کے لحاظ سے الہام یافتہ ہے لیکن شہوات اور حیوانی خواہشات نفس کو بہلا پھسلا کر اپنا اسیر بنا لیتی ہیں اور روحِ شہوت (جس کا بیان آگے آئے گا) نفس کی لگام کو تھام کر اسے بُرائی کے راستوں پر لے چلتی ہے اور یوں **نفسِ ملھمہ**' degrade ہو کر **نفسِ امارۃ بالسوء** بن جاتا ہے۔

(ج) **نفسِ ملھمہ** میں موجود شعورِ الہامی جب تک خدا کی معرفت کے حصول کی جانب متوجہ نہ ہو، ایمان اور اعمالِ صالحہ کے زیور سے اپنے کو آراستہ نہ کرے اُس وقت تک اس کا رُخ بلندیوں کی جانب نہیں ہوتا۔ جناب یوسفؑ اِس مرحلے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''**اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّی** ''یعنی جب تک نفسِ انسان پر اللہ کی نظرِ رحمت و عنایت کا التفات نہیں ہوتا اس وقت تک نفس برائی کا امر کرنے والا اور شہوات کی پیروی کرنے والی حالت میں ہی مقید رہتا ہے۔ اور ہم نے کیسے اخذ کیا کہ اللہ کی جانب سے نظرِ رحمت کا مطلب ہے توفیقِ ایمان اور عملِ صالح کا عطا ہونا' تو اس کی دلیل ابتدائے سورۃ العصر، سورۂ معارج کی آیات نمبر ۱۹ تا ۳۵ اور سورۂ والتین کی آیات نمبر ۴ تا ۶ ہیں۔ اگر آپ اِن آیاتِ کریمہ کو ملاحظہ فرمائیں تو یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ انسان کا فارمولا اور اس کی اصل خلقت بے مثل و لاجواب ہے' لیکن انسان کی شخصیت میں وزن اور قدر و قیمت کا فقدان ہے جس کی وجہ سے انسان مضطرب' حریص اور جھگڑالو بن جاتا ہے اور یہ کیفیت اُسے

پستیوں میں لے جانے کا سبب بنتی ہے۔ اِس حالت سے وہی لوگ باہر آ سکتے ہیں جو ایمان اور معرفتِ حق کو اپنے وجود یعنی نفس میں جاگزیں کریں اور اعمالِ صالحہ کی ریاضت میں مشغول رہیں۔ اور یہ توفیقات اللہ کی رحمت و مہربانی کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ کیا رحمتِ الٰہی پر انحصار بے عملی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کی دعوت ہے؟ ہرگز نہیں! **نفسِ ملهمه ذمه دار بھی هے، وه کیسے ؟** اس طرح کہ اللہ نے اُس کے ہاتھ میں نیت، ارادہ اور کوشش کو رکھا ہے اور اس کی ذمہ داری ہے کہ اِن وسائل کی راہ سے اور اپنے اختیار اور ارادے کی بنیاد پر وہ ایمان اور عملِ صالح کو طلب کرے گا اور جواب میں رحمتِ الٰہی اس کی جانب متوجہ ہوگی جس کے سبب سے توفیقاتِ خیر نفس کے شاملِ حال ہو جائیں گی اور اُسے بلندی و رفعت عطا کرنے کا سبب بنیں گی۔ ورنہ اگر نفسِ ملھمہ ارادہ کو حرکت میں نہ لائے اور ہدایت کے راستے میں سعی کرنے کے بجائے یونہی پڑا رہے تو از خود ''امارۃ بالسوء'' بن جائے گا اور شیطنت وحیوانیت کی اسیری میں مسلسل سقوط کرتا رہے گا۔

(د) جنابِ یوسفؑ نفسِ امّارہ کی خراب حالت کو بہتر بنانے کی واحد سبیل پروردگار کی رحمت کو قرار دینے کے بعد نفس کی ترقی اور بلند درجات کے حصول کا نسخہ بیان فرماتے ہیں، یعنی ''اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْم'' جس کا مطلب یہ ہوا کہ نفسِ انسان قعرِ مذلّت سے باہر آ کر رب کی مغفرت اور رحیمیت کے وسیلے سے اپنے ارتقا کو حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بالکل وہی ترکیب ہے جو سورۂ اعراف میں جنابِ آدم صفی اللہ اور ان کی زوجہ بی بی حواؑ کے واقعے میں ہمارے مشاہدے میں آتی ہے جہاں دونوں حضرات شجرِ ممنوعہ کو چکھنے کے بعد پروردگار کی بارگاہ میں یوں استغاثہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ: ''قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ.'' (سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۲۳) **ترجمه: دونوں (آدمؑ اور اُن کی زوجه) نے کها، اے همارے رب همارے نفوس نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو نے همارے لئے مغفرت نه کی اور هم پر رحم نه فرمایا تو هم یقیناً خساره پانے والوں میں هو جائیں گے.** غور فرمائیے کہ جب نفس ظالم بن گیا یا ظلمتوں میں گھر گیا تو صرف رب کی مغفرت اور رحیمیت کی راہیں ہیں جن کے وسیلے سے وہ خسارے والی حالت سے باہر آ سکتا ہے۔ اِس مقام پر نامناسب نہیں ہوگا اگر ہم ایک جملے میں اسماء غفور اور رحیم کے ایک گہرے مطلب کی جانب اشارہ کرتے چلیں۔ 'غَفَرَ' کا مطلب ہوتا ہے ڈھانپ لینا' یا ہر جانب سے احاطہ کر لینا۔ اللہ جب کسی انسان کی مغفرت فرماتا ہے تو اس کا مطلب گناہ کے قبیح نتائج کو مٹا دینا یا محو کر دینا نہیں ہوتا بلکہ اس انداز سے بندے کو آغوشِ رحمت میں سمیٹ لینا ہوتا ہے کہ بندے سے وہ عیوب اور نقائص دور ہو جائیں جن کی وجہ سے بندہ گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسے ہی رحیمیت اللہ کی رحمت کا وہ جلوہ ہے جو ان انسانوں کے لیے مخصوص ہے جو اللہ کی ولایت کو قبول کر چکے ہیں اور اُسے اپنے امور کا مدبر تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے افراد کا نفس جب بھی گناہ، معصیت یا خطا کی وجہ سے آلودہ ہو جاتا ہے اور وہ اس میں ''امارۃ بالسوء'' کے آثار محسوس کرنے لگتے ہیں تو فوراً اپنے رب کی بارگاہ میں رجوع کرتے ہیں اور رب کی رحیمیت اُن کی مدد کے لیے آمادہ ہوتی ہے اور انہیں اِس حالتِ ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جاتی ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۷ میں ارشادِ ربانی ہے کہ: اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْر. اب یہ راز آپ پر ضرور آشکار ہو گیا ہوگا کہ جنابِ یوسفؑ اور حضرت آدمؑ نفس کی پستی اور ظلمت کو دور کرنے کے لیے کیوں رب العالمین کے اسمائے حسنہ **غفور اور رحیم** سے استفادہ کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

(۳) **نفسِ لوامه**: یعنی ملامت کرنے والا نفس۔ سورۂ قیامت (۷۵) کی ابتدائی آیات میں خدا نے **نفسِ لوّامه** کی قسم کھائی ہے: وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۔ نفس کی ملامت والی حالت اللہ کے نزدیک قابلِ پسندیدگی ہے، ورنہ وہ نفسِ لوامہ کی کبھی قسم نہ کھاتا۔ یہاں یہ امر بھی

مورِدِنظر رہنا چاہیے کہ نفس ملامت والی حالت اور کیفیت سے اسی وقت دوچار ہوگا جب پستی، گراوٹ اور ظلمت کے اثرات سے بے چین اور پشیمان ہونے کے بعد نیکی، خوبی اور نورانیت کی برکات کی جانب پیش قدمی کرنے کا ارادہ کرلے۔

اس مقام پر سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نفس میں یہ ملامت والی کیفیت کیوں پیدا ہوتی ہے؟ بالفاظِ دیگر نفسِ لوامہ کی حالت میں ایک کشمکش اور ٹکراؤ والی کیفیت نظر آ رہی ہے، تو سوال یہ ہے کہ یہ کشمکش کس کے درمیان ہے؟ نفس ایک ہی ہے، انسان کی حقیقت واحد ہے، تو انسان کے اندر باہمی متصادم قوتیں کون سی ہیں؟ اس موقع پر بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہی جہاد بالنفس ہے۔ یعنی انسان کا اپنے نفس کے خلاف جہاد۔ دیگر افراد یہ کہتے ہیں کہ انسان میں موجود خیر کی طاقتیں شر کی قوتوں سے دست و گریباں رہتی ہیں جس کے نتیجے میں انسان اور نفس کے اندر کشمکش اور ملامت والی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان نظریات میں یہ خامی ہے کہ مذکورہ افکار نفس کی حقیقت سے غفلت پر مبنی ہیں اور انسان کے وجود کو خواہ مخواہ مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کا باعث ہیں جس کی وجہ سے ہم معرفتِ نفس کی راہ میں پیش قدمی کرنے کے بجائے ابہامات اور گنجلک پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسان کا وجود حقیقت واحدہ اور اکائی ہے جس کے رُخ، جہتیں اور درجات تو بہت سارے ممکن ہیں لیکن اس کے اندر تقسیم کا امکان نہیں پایا جاتا۔ یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک حقیقت خود انسان ہے اور دوسرا موجود اس کا نفس ہے جو بُرائی کا حکم دیتا ہے اور انسان اپنے نفسِ امّارہ سے برسرِ پیکار ہے، یعنی جہاد بالنفس میں مشغول ہے۔ ذرا سی دِقت اس نظریے کے بودے پن کو واضح کر دیتی ہے یعنی انسان کے وجود میں دو علیحدہ چیزیں نہیں پائی جاتیں جن میں سے ایک انسان خود ہو اور دوسرا اس کا نفس جو باہم متصادم ہوں، بلکہ نفس خود انسان ہے اگر نفس بیدار ہو تو انسان بیدار ہے اگر نفس غافل ہے تو انسان غافل ہے اور جب انسان مدتِ اجل کو پورا کر لے تو نفس اگلے عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ انسان الگ اور نفس الگ۔ یہ ایک ہی وجود کے خارجی اور باطنی رُخ ہیں ان میں ہرگز دوئی اور جدائی نہیں۔

اسی طرح سے یوں بھی ممکن نہیں کہ ایک نفس ہے جو اچھائی اور خیر سے متعلق ہے اور دوسرا نفس ہے جو بدی اور شر کا نمائندہ ہے اور وجودِ انسانی کے اندر یہ دونوں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ نفس اکائی اور حقیقتِ واحد ہے اس کی یوں تقسیم ممکن نہیں۔ تو پھر اصل بات کیا ہے؟ انسان کے وجود کے اندر کشمکش میں رہنے والی قوتیں کون سی ہیں اور کون کس کو ملامت کرتا ہے؟

ان سوالات کا جواب ایک اور طریقے سے بھی دیا جا سکتا ہے جس کی رو سے نفس کے بارے میں ہمارا بنیادی اور اصلی تصور مجروح نہیں ہوتا۔ آیئے اس نظریے پر نسبتاً تفصیل سے روشنی ڈالیں۔:

انسان کا نفس ایک طرف تو فطری ہدایت کا الہام رکھتا ہے اور دوسری جانب جسمانیات و مادّیات سے ملحق ہونے کی وجہ سے حیوانی رجحانات اور خواہشات کی جانب بھی مائل ہے۔ فطری ہدایت نفس کو معبودِ حقیقی کی پرستش کی سمت کھینچتی ہے، جبکہ حیوانی خواہشات نفس کو پستیوں میں دھکیلنے کی تگ و دو میں مصروف رہتی ہیں۔ غور فرمائیں کہ یہ خود انسان یا اُس کا نفس ہے جو دو متضاد Pulling Forces کے زیرِ اثر آ گیا ہے۔ ایک قوت نفس کو بلندیوں کی جناب کھینچنا چاہتی ہے اور دوسری طاقت اسے پستیوں میں گرانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی کشمکش کے دوران حیوانی جہت مادّی، جسمانی اور فانی لذتوں کو سجا کر نفس کے سامنے لاتی ہے اور یہ ترغیب دلاتی ہے کہ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست''، یعنی جتنے مزے حاصل کرنا ہیں، جتنی عیاشی کرنا ہے جلد از جلد کر ڈالو کہ یہ جسم و جوانی دوبارہ ملنے والی نہیں۔ لیکن دوسری جانب سے ہدایتِ فطری نفس کو ملامت کرتی ہے کہ صرف جسم کے پیچھے جانا اور روحانی ارتقا کو یکسر نظر انداز کر دینا تمہیں ایسے گڑھے (جہنم) میں گرا دے گا جس سے کبھی بھی نہ نکل پاؤ گے۔ یعنی ایک جہت راغب کرتی ہے

کہ اے نفس ہر شئے سے غافل ہو کر تعیّشاتِ جسمانی میں غرق ہو جا اور دوسری جہت ملامت کرتی ہے کہ غفلت سے بیدار ہو، محدود مدت کے لئے تہذیب و تربیت کی سختیوں کو برداشت کر اور اپنے معبود کی بندگی کی راہ پر چل نکل تا کہ ابدی نجات کی راہوں کو طے کرنے کے قابل ہو جائے۔

مذکورہ بیان سادہ الفاظ میں وضاحت کرتا ہے کہ نفس میں کشمکش کیوں کر پیدا ہوتی ہے اور نفس ملامت والی حالت میں کیسے آتا ہے۔

اس حالت کو دقیق تر الفاظ میں یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ نفسِ انسان جو اپنی بُرائی اور نیکی کا الہام رکھتا ہے، جب اپنے کو ایسی حالت میں پاتا ہے کہ مادّی اور حیوانی خواہشات اور میلانات اُسے ایک تاریک بادل کی مانند ڈھانپ رہے ہوں، تو وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرنا شروع کر دیتا ہے کہ اس مصیبت سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر اور اپنی اصلی اور فطری حالت میں واپس آ جا۔ اس لحاظ سے جہاد بالنفس کا مطلب یہ ہوا کہ نفس اپنے اوپر ہونے والی شیطانی اور حیوانی یلغار کا مقابلہ کرے، اپنے اندر پیدا ہونے والی خرابیوں کو دور کرے اور اپنے تزکیے کا بہتر سے بہتر سامان کرنے کے قابل ہو جائے۔ پس واضح ہو جانا چاہیے کہ جہاد بالنفس انسان کے وجود کے اندر دو طاقتوں کی جنگ کا نام نہیں ہے بلکہ نفس کی اُس جدوجہد سے عبارت ہے جس کا نتیجہ نفس کے تزکیے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ تزکیۂ نفس، یعنی نفس اُن تمام خوبیوں کو حاصل کر لے جو اُس کی ترقی کے لیے ضروری ہیں اور اُن تمام خرابیوں سے چھٹکارا حاصل کر لے جو اُس کی سرافرازی کی راہ میں مزاحم اور حائل ہیں۔

نفس کے اندر ملامت والی کیفیت میں شدت پیدا ہو جانا سبب بنتا ہے کہ نفس حق کی راہ میں تیزی اور سرعت سے پیش قدمی کرے اور جب نفس اس امر کو واضح طور پر شک شبہ اور ابہامات سے بالاتر ہو کر اختیار کر لے کہ مجھے فطری ہدایت کے زیر اثر الٰہی اساتذہ کی پیروی ہی کی راہ پر چلنا ہے تو اُس کی ''امارۃ بالسوء'' والی حالت ختم ہو جاتی ہے اور اطمینان و سکون کی حالت کی جانب پیش قدمی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر اللہ رب العزت کی خصوصی توفیقات، عنایات اور ہدایات نفس کے شاملِ حال ہو جاتی ہیں اور اللہ کی مغفرت و رحمت اُس کے سر پر سایہ فگن ہو کر نفس کو اپنی پناہ میں لیتے ہوئے ابدی سعادت کی راہوں پر گامزن کرا دیتی ہیں۔ **اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡر**۔

(۴) نفسِ مطمئنہ، راضیہ و مرضیہ: نفسِ لوامہ ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے بالآخر اطمینان کی منزل پر پہنچ کر نفسِ مطمئنہ بن جاتا ہے۔ اِسے ہم نفس کے کمال کی پہلی منزل قرار دے سکتے ہیں۔ اِس سے پہلے تمام مراحل میں نفس، شیطان اور خود اپنے حیوانی رجحانات کی دستبرد سے محفوظ و مامون نہیں تھا، اُس کے اندر اضطراب اور بے چینی پائی جاتی تھی، لیکن اب وہ الٰہی ہدایت و رہنمائی کے زیرِ سایۂ اطمینان کی صفت کو بطورِ مَلَکہ حاصل کر چکا ہے۔ یعنی نفس اب اس حقیقت کو اچھی طرح پہچان چکا ہے کہ **"لامُؤثّر فی الوجود اِلا اللّٰہ"** اور'' **هُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الۡبَاطِنُ** ''(سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۳) بالفاظِ دیگر یہ سچائی اب اس کے ادراکات سے محجوب اور ماوراء نہیں ہے کہ کل کائنات اور تمامِ وجود، حقیقتِ واحدہ کی تجلی ہے اور کوئی شئے اُس کے تسلط اور اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ اس مشاہدے کے ساتھ کامل بندگی کا احساس نفس کو اطمینان کی حالت میں داخل کرنے کا سبب بنتا ہے۔ یعنی اب نفس صرف اللہ کی حقیقی معرفت سے بہرہ مند ہی نہیں بلکہ مطمئن بھی ہے کہ میرے تمام امور کی تدبیر بلکہ میری زندگی اور موت کا اختیار اُس کے دستِ قدرت میں ہے جو لازوال اور لامحدود بھی ہے اور رحمٰن و رحیم ہونا بھی اُسی کی صفت ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نفس کی کامل ترین حالت نفسِ مطمئنہ ہے لیکن قرآنِ کریم میں اس سے آگے کے مراحل کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اگر ہم سورۂ والفجر کی آخری آیات پر غور کریں تو یہ درجات سمجھ میں آتے ہیں، ارشادِ باری ہے:

''يٰٓاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِىۡٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً فَادۡخُلِىۡ فِىۡ عِبٰدِىۡ وَادۡخُلِىۡ جَنَّتِىۡ''

مندرجہ بالا آیت میں خدائے بزرگ و برترنفسِ انسانی کونفسِ مطمئنہ کے نام سے پکار رہا ہے لیکن اس حالت کوارتقائے نفس کا کمال نہیں قرار دے رہا بلکہ نفسِ مطمئن کودعوت دے رہا ہے کہ ''اپنے رب کی طرف رجوع کر'' اور رجوع کرنے کے بعد کی حالتوں میں راضیہ اور مرضیہ سے بھی باخبر فرما رہا ہے۔ مطمینّہ کے بعد والی حالتیں اولیاء کُمّل اور معصومینؑ سے مربوط ہیں لہذا انکی مبسوط اور مفصل تعریف کو بیان کرنے کی جسارت اور جرائت یہ ناچیز قلم نہیں کرسکتا لیکن آنے والے صفحات میں معرفت کی تکمیل کے واسطے کچھ اشارے ضرور کردیں گے۔

ارتفاع اورارتقائے نفس کے عملی تقاضے

اس مقام پر پہونچنے کے بعد ضروری ہے کہ نفس کی ارتقائی یا بلند حالتوں کے حصول کے حوالے سے عملی پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا جائے۔ کیونکہ یہ مقام خصوصی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس مرحلے کودقت کے ساتھ تجزیہ وتحلیل کی منزل سے گزارا جائے۔

ا۔ پہلا اوراہم ترین سوال یہ ہے کہ نفس اطمینان کے مرحلے تک کیسے پہنچتا ہے۔ہم نے ابتک نفس کی چار حالتوں کا تذکرہ کیا جن میں ترقی، حالت لوّامہ سے شروع ہوتی ہے تو کیا صرف نفس کا اپنے کوملامت کرنا اُس کی ترقی کا باعث بنتا ہے؟ کیا پشیمانی کی حالت بذاتِ خودارتقا کا وسیلہ ہے یانفس جب اپنی امّارة بالسوء والی حالت سے شرمندہ ہوکرعبادات کوانجام دینا شروع کرتا ہے ،معاملات کودرست کرتا ہے تو اطمینان کے درجے تک ترقی کرنے کے قابل ہوجاتا ہے؟ اس مرحلہ فکر پرجس حقیقت کا سمجھ لینا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ انسان کا کمال اس کے نفس میں موجود صفات اورخصوصیات کی بنا پر ہے۔قرآنِ کریم کی آیات کے مطالعے سےبھی یہ حقیقت واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ نفس کی ترقی کی اصل وجہ اُس میں پیدا ہونے والی صفات ہیں اورصفات کے پیدا ہونے کی وجہ عقل کا درست استعمال، آیاتِ الٰہیہ میں دیانتدارانہ تفکر،حق کی معرفت اورمحبت جیسے امور ہیں۔اِس ضمن میں مختلف اعمال بھی انسان کی مدد کرتے ہیں جن میں پرخلوص عبادات کے ہمراہ سب سے اہم امور اللہ کے مجبور اور مقہور بندوں کی خدمت اوراُنہیں پریشانی اوراذیت سے نجات دلانا ہیں۔

۲۔ اس مرحلہ فکر پر اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی صفات ہیں جن کا حصول نفس کومطمئن بنانے یا حالتِ اطمینان عطا کرنے کے لئے لازمی ہیں؟ وہ بنیادی صفات جن کے حصول کے بعد نفس اطمینان کی منزل تک پہنچنے کے لائق اور قابل ہوجاتا ہے' حسبِ ذیل ہیں:

(i) عبدیت یا بندگیٔ خدا۔

(ii) تقوائے الٰہی یا God Consciousness۔

(iii) زہد در دنیا۔

اگر ہم یہ کہیں کہ تمام اوصافِ ایمانی وانسانی ان تین صفات سے اخذ کی جاسکتی ہیں' تو شاید بے جا نہیں ہوگا۔

قبل اس کے کہ ہم ان تین صفات کی جامع تعریف بیان کریں اس امر کو واضح اور بیّن کر دینا چاہتے ہیں کہ صرف اعمال اور عبادات کی ظاہری بجا آوری سے نفس ترقی کے مراحل طے نہیں کرتا' بلکہ عبادات کے Effective ہونے کے لیے لازمی ہے کہ ہر عبادت کی انجام دہی نفس میں موجود کسی صفتِ حَسَنہ کی بنا پر ہو' صرف جنت کی لالچ میں یا جہنم کے خوف سے نہ ادا کی جائے۔مثلاً نماز صفتِ بندگی سے جنم لے' روزہ صفتِ تقویٰ سے نمودار ہو اور خمس وزکات کی بنیاد صفتِ زہد پر ہو۔اگر اِس انداز سے عبادات انجام دی جائیں تو نہ صرف عبادت بندے کا سرمایہ بنے گی بلکہ یہی عبادت ان صفات کو مزید مستحکم کرنے کا ذریعہ بھی بنیں گی جن کی بنیاد پر انجام دی گئیں تھیں۔صفات ہی درحقیقت ایمان کی موجودگی اور معیار کا تعین کرتی ہیں۔

اِس ترقی کے فارمولے کو اگر ہم Traversing a Spiral کا نام دیں تو غلط نہ ہوگا۔ Spiral کی شکل کو اگر ذہن میں ملاحظہ فرمائیں تو یہ امر بخوبی واضح ہوجائے گا کہ ہر ایک چکر یا دائرہ مکمل کرنے کے بعد اصل مقام کے مقابلے میں ایک درجہ بلندی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سیرِ الی اللہ میں بندۂ مومن ایک دائرے میں حرکت کر رہا ہوتا ہے لیکن ایک دورہ مکمل کرنے کے بعد اپنے پچھلے مقام سے ایک درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ وہ دائرہ جس میں نفس سفر کرتا ہے اُس کا آدھا حصہ ایمان اور دیگر نصف عملِ صالح پر مشتمل ہے۔ ایمان کو اولویت حاصل ہے یعنی پہلے ایمان وجود میں آئے گا پھر عمل میں صالحیت نمودار ہوگی۔ ایمان کی بنیاد پر عملِ صالح ظہور پذیر ہوتا ہے اور عملِ صالح کے نتیجے میں ایمان مضبوط اور قوی تر ہو جاتا ہے۔ ایمان کی ترقی نفس کی ترقی کا سبب بنتی ہے اور یہی دائرہ پھر سے تشکیل پانا شروع ہو جاتا ہے لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ اب نفس کا معیار پہلے کی بہ نسبت بلند ہو چکا ہوتا ہے۔ اگر کوئی نفس ایمان یا عملِ صالح میں سے کسی ایک اصل کو بھی نظر انداز کر دے تو وہ کولھو کے بیل کی مانند وہم و خیال کے ایک دائرے میں گھومتا رہے گا حتیٰ کہ جو کچھ اُس کے پاس ہے وہ سب ضائع اور خراب کر بیٹھے۔

۳۔ آیئے اب تین مذکورہ صفات کی بنیادی تعریف کو مختصر مگر غیر مبہم انداز میں سمجھ لیں۔

(i) **عبدیت**: عبدیت یا بندگی کی اللہ کے نظام میں اہمیت اس درجہ بنیادی ہے کہ قرآن کریم میں اِس صفت کو جن وانس کی خلقت کی اصل وجہ قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ والذاریات کی آیت ۵۶ میں خوس اللہ تخلیق کا مقصد یوں بیان فرما رہا ہے کہ: **و ما خلَقْتُ الْجِنَّ وا الانْسَ اِلّا لِیَعْبُدُون** • یعنی میں نے جنات اور انسانوں کو خلق کیا ہی نہیں ہے مگر اِس لئے کہ وہ 'عبد' ہو جائیں۔ خدا کا بندہ یا عبد، وہ ہوتا ہے جو اللہ کے سامنے کاملاً خاضع اور خاشع ہو' جس کے اور خدا کے درمیان کوئی رکاوٹ' مزاحمت' شک' شبہ اور بے اعتمادی نہ پائی جائے۔ اسی حقیقت کو تھوڑے سے عملی انداز میں بیان کیا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ اور نفس کے مابین جس قدر حجابات موجود ہیں اُن کا اٹھتے جانا اور برطرف ہونا بندگی کی صفت میں اضافہ اور تقویت کا باعث بنتا ہے۔ جدید علوم کی اصطلاح میں اسی بات کو یوں کہئے کہ بندۂ خدا وہ ہے جس کے اور خدا کے مابین رابطہ ایک Super-conducting link کے ذریعے قائم ہو۔ جتنا اس رابطے میں Resistance پیدا ہوگی اتنی ہی بندگی کی Quality خراب ہو جائے گی۔ اِس کے بالمقابل جتنی رابطے میں روانی ہوگی اتنا ہی صفتِ بندگی میں استحکام اور نکھار پیدا ہوگا' نفس کی ترقی کے لیے اور حالتِ اطمینان تک پہنچنے کی خاطر بندگی اصل صفت ہے۔ بغیر جوہرِ بندگی کے نفس چاہے کتنی ہی عبادت و ریاضت میں مشغول رہے کبھی بھی ترقی یافتہ نہیں ہوسکتا ہے' چہ جائیکہ مطمئنہ بن سکے۔

اِس حقیقت کو روشن کرنے کے لیے صرف پیغمبر اکرمؐ کے سفرِ معراج پر نظر ڈالنا ہی کافی ہوگا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں آپ کے سفر کے آغاز کا بیان ہے اور سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں آپ کے احوال اور مکاشفات کی تفصیل ملتی ہے۔ ان تمام مقامات پر اگر ہم بدقت غور کریں تو آشکار ہوگا کہ معبود نے حضورﷺ کو صرف اور صرف عبدیت کی صفت کے ساتھ یاد فرمایا ہے کہیں بھی نبوت اور رسالت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی اللہ نے کہیں بھی یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اپنے نبی یا رسول کو سیر کرائی یا نبی یا رسولؐ سے معراج پر خطاب فرمایا' بلکہ ابتدائے سفر میں **سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا** (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱) اور انتہائے کمال پر پہنچ کر **فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی** (سورۂ نجم ۵۳۔ آیت ۱۰)۔ پس ثابت ہوا کہ نفس کے تمام کمالات کا واحد اور اصل معیار بندگیٔ معبود کے درجات ہیں۔ بندگی کے اظہار کا افضل ترین عملی ذریعہ نماز ہے اور یہ نماز ہی ہے جس کے وسیلے سے بندگی کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ بندگی کا جوہر نمازی کی عقل کو نورِ خدا سے روشن کرتا ہے اور اُس کے قلب کو بارگاہِ پروردگار میں عاجزی کے ساتھ جھکا دیتا ہے۔ اِس کیفیت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے: "**قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْن**". (سورۂ مومنون ۲۳۔ آیت ۲) **ترجمہ: بے شک فلاح پائی اُن مومنین**

نے جو اپنی نمازوں میں خاشع ھیں۔خشوع یعنی قلوب کا اللہ کی بارگاہ میں جھکا ہوا ہونا۔

(ii) تقویٰ: بندگی کا جوہر، نفس میں تقویٰ اور زہد کی صفات کے جنم لینے کا سبب بنتا ہے۔ ہم عام طور سے تقویٰ کے معنی ''حرام سے پرہیز'' کو سمجھتے ہیں۔ یعنی جو شخص اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرے اور اپنے کو گناہوں سے محفوظ رکھے وہ متقی ہے۔ جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ حرام سے بچنا اور گناہوں سے اجتناب کرنا تقویٰ کا نتیجہ اور ثمر ہے، اِس کی تعریف نہیں ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو درست ہوگا کہ تقویٰ ایک صفت کا نام ہے عمل کا نہیں اور جس انسان میں یہ صفت پائی جائے، وہی متقی کہلائے گا۔ دوسرے لفظوں میں انسان صفتِ تقویٰ کی وجہ سے حرام سے بچتا ہے، گناہوں سے پرہیز کرتا ہے اور خطاؤں سے محفوظ و مصون رہتا ہے۔ بقول شہید مطہری کے کہ متقی انسان کی مثال اُس ڈاکٹر کی سی ہے جس نے وبائی اور مہلک امراض سے بچاؤ کی Vaccination لی ہوئی ہو، مریضوں کے درمیان میں چلے پھرے تا کہ اُن کا علاج کر سکے، لیکن اُن میں موجود امراض اُس پر اثر انداز نہ ہو سکیں، اُسے بیمار نہ کر سکیں۔

صفتِ تقویٰ نفس کو مطمئنہ کی منزل تک پہنچانے کے لیے لازمی طور پر درکار ہے لیکن یہ صفت نفس کو کب اور کیسے حاصل ہوگی؟ نفس صفتِ تقویٰ کا حامل اُس وقت ہوتا ہے جب جلوت و خلوت میں، ہر زمان و مکان میں اپنے آپ کو خدا کی نگاہوں کے سامنے حاضر جانے۔ بارگاہِ پروردگار میں ہمہ وقت حضوری کی کیفیت جیسے ہی نفس کو حاصل ہوگی وہ متقی ہو جائے گا۔ یعنی اب کوئی شئے کسی بھی وقت، کسی بھی حالت میں اُسے معصیت اور گناہ پر آمادہ نہیں کر سکتی، کیونکہ نفس کو یقین ہے کہ میں ہر لمحہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ لیکن اِس مقام تک پہونچنے کے لئے لازمی ہے کہ نفس عبدِ خدا کی حیثیت سے اپنے وجود کی سچی معرفت کا حامل ہو۔ اللہ کا بندہ ہی متقی بن سکتا ہے اور جس نفس میں اللہ کے لئے خشوع نہ موجود ہو اُس میں صفت تقویٰ بھی پیدا نہیں ہوگی۔

ہماری بیان کردہ تعریف کو سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۳ میں بیان شدہ مضمون سے سمجھ سکتے ہیں جس میں روزے کا ثمر اور نتیجہ حصولِ صفتِ تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے: **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمنُو کُتِبَ علیکُمُ الصیام .... لَعَلَّکُم تَتَّقون.** غور فرمایئے کہ روزے میں جو سب سے اہم کام انسان انجام دیتا ہے وہ یہ یاددہانی ہے کہ میں ہر وقت اللہ کی نظروں کے سامنے حاضر ہوں اور ایک ذرّہ برابر بھی کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہونا چاہیے جو روزے کو باطل کر دے۔ اسی وجہ سے شدید گرمی کے روزے میں بھی کوئی روزہ دار تنہائی میں جا کر ٹھنڈے پانی کے دو گھونٹ نہیں پیتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اُسے یہ احساس دامن گیر ہے کہ اکیلے میں کوئی انسان تو مجھے نہیں دیکھ رہا ہے لیکن خدا کے مشاہدے سے غائب نہیں ہوں۔ یہ (روزہ یا صوم) وہ عمل ہے جس کی غایت، نتیجہ، فائدہ صفتِ تقویٰ کے حصول سے عبارت ہے۔ اسی لئے اللہ آیت کے آخر میں فرما رہا ہے کہ (**لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ**) یعنی اگر ایک مومن روزے کو اُس کی روح کے ساتھ انجام دے تو امید ہے کہ اِس مقام کو حاصل کر لے گا کہ اپنے آپ کو ہمیشہ محضرِ خدا میں دیکھے، یا اصطلاحاً متقی ہو جائے۔

یہ صفتِ تقویٰ ہی ہے جو عبدِ باتقویٰ کو خدا تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایام حج میں قربانی کا ذکر کرتے ہوئے اللہ اعلان فرماتا ہے کہ: **لن ینال الله لحو مها و لا د مائوها وَ لٰکِن ینَالُهُ التَّقْوٰی مِنْکُم** (سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۷) یعنی گوشت اور خون اِس بات کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ اللہ تک پہنچ سکیں، لیکن انسان کا تقویٰ اللہ کی بارگاہ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، اور کیونکہ تقویٰ صفت ہے جو موصوف کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی لہٰذا اگر تقویٰ اللہ تک پہونچے گا تو متقی بھی یقیناً اللہ کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرے گا۔

تقویٰ کا موضوع طولانی بحث کا متقاضی ہے لیکن فی الوقت معرفتِ نفس کے تناظر میں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ تقویٰ وہ صفت ہے (عمل نہیں) جو نفس کو اُس وقت نصیب ہوتی ہے جب نفس عبدِ الٰہی بن جائے۔ تقویٰ کے نتیجہ میں نفس اپنے آپ کو ہمہ وقت محضرِ الٰہی میں پاتا ہے اور اس کا اولین

نتیجہ ہر اُس عمل سے اجتناب ہے جو رضائے رَب کے منافی ہو۔ تقویٰ کا اصلی اور حتمی نتیجہ بندے کو خدا تک پہنچانا اور نفس کو اطمینان وسکون (طمانینہ وسکینہ) عطا کرنا ہے۔

(iii) زہد: زہد کی صفت بھی اسلامی تعلیمات کے بنیادی خمیر میں گُندھی ہوئی ہے لیکن تقویٰ کی مانند، زہد کی تعریف کا بیان بھی اکثر مقامات پر غلط فہمی کا شکار ہے۔ زہد کی تعریف کے حوالے سے جنابِ امیر المومنینؑ کا قول ہمارے فہم ومعرفت کے لئے بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ قرآن نے زہد کو دو جملوں میں سمیٹ دیا ہے۔ (۱) **لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ** (۲) **وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ** (حوالہ: سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۲۳) جن کا ترجمہ یوں ہے کہ ''؛ (۱) جو کچھ تم فوت کر بیٹھو اُس پر مایوس نہ ہو جاؤ؛ اور (۲) جو تمہیں عطا کر دیا جائے اُس پر خوشی میں آپے سے باہر نہ ہو جاؤ''۔ اگر ہم اِن دو فرمائشات پر غور کریں تو سمجھ میں آئے گا کہ صفتِ زہد نفس کو غیر معتدل ہونے سے، افراط وتفریط میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھتی اور حقیقی اطمینان وسکون کے حصول کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ کیونکہ نعمتوں کے حصول کے وقت اگر خوشی اور مسرت کا احساس نفس پر غلبہ حاصل کر لے تو وہ رفتہ رفتہ ریاکاری، خود پسندی اور تکبر جیسے امراض کا شکار ہو سکتا ہے اور دوسری جانب جب نعمتیں ہاتھ سے جاتی رہیں تو پیدا ہونے والی مایوسی نفس کو ناشکری، خدا سے بدگمانی اور عزتِ نفس کو فروخت کر دینے جیسے مختلف گناہوں میں مبتلا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ چاہے حد سے بڑھی ہوئی خوشی ہو یا انتہا سے زیادہ مایوسی؛ اِن دونوں صورتوں میں نفس کے لئے ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور منزلِ اطمینان باللہ کے مقام تک رسائی اُس کے لیے ممکن نہیں ہو سکتی۔ صفتِ زہد نفس کو مادّی اثرات سے بے نیاز کرنے کا وسیلہ ہے۔

لیکن ابھی ہمارے لیے یہ مسئلہ حل نہیں ہوا کہ نفس میں صفتِ زہد کب اور کیوں پیدا ہوتی ہے؟ وہ کیسے اس قابل ہو جاتا ہے کہ نعمتوں کے آنے پر فرحناک نہ ہو اور نعمتوں کے رخصت ہونے پر مایوسی سے مغلوب نہ ہو سکے۔ صفتِ زہد نفس میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ہر شئے کو بالعموم اور جو کچھ اُس کے پاس ہے کو بالخصوص، مالِ خدا سمجھے اور ملکیتِ پروردگار جانے، اپنے آپ کو صرف نعمتوں کا Custodian سمجھے، نہ کہ مالک اور اپنا فریضہ اِس امر کو قرار دے کہ مالِ خدا اُن مقامات پر خرچ ہو جہاں خدا نے حکم دیا ہے اور اُن موارد میں تصرف سے گریز کرے جہاں مالکِ حقیقی کی رضا جائز نہیں سمجھتی۔ اسی لئے تمام انفاقی عبادات، یعنی وہ عبادات جن میں انسان کا مال اور سرمایہ خرچ ہوتا ہو، زہد سے مربوط ہیں۔ صفتِ زہد کا کمال یہ ہے کہ نفس، دنیا کے تمایلات اور تعلقات سے اپنے آپ کو صرف اللہ کی محبت کی وجہ سے پاک کر لے جس کا مطلب تعلقات کو ترک کرنا نہیں ہے بلکہ ہر تعلق کو تعلق باخدا کے ماتحت لے آنا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا میں کسی شئے کا فوت ہو جانا اُسے رنجیدہ نہ کرے اور غیر از خدا کسی نعمت کا حاصل جانا اُسے شادمان و فرحناک نہ کر سکے۔

حصولِ اخلاص اور نفسِ مطمئنّہ کی مزید ترقی

یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ نفس کی ترقی یافتہ حالت دراصل نفس میں پیدا ہونے والی صفات کا عکس (Reflection) ہوتی ہے۔ بندگی، تقوی اور زہد کی بنیادی تعریف کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اِس نتیجے تک پہنچنا چنداں مشکل نہیں کہ اِن صفات کا حامل نفس اطمینان کے ساتھ ساتھ اخلاص کے درجے پر پہنچ کر ''**مخلصین**'' کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ یعنی اب نفس کی کیفیت وحالت میں purity آ چکی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب جسمانیات کی راہ سے نفوذ کرنے والی ناپاکی اور آلودگی نہ صرف رخصت ہو گئی ہے بلکہ اُن کا داخلہ بھی مملکتِ نفس کی حدود میں ممنوع ہے۔ اس حوالے سے یاد رہے کہ نفس کو غیر الٰہی اثرات سے پاک کرنے اور الٰہی صفات کے نقوش کو لوحِ نفس پر ثبت کرنے میں تعلیم کردہ عبادات اور مناجات کی اہمیت کو کسی طور بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں اور جو لوگ بھی ایسی خام خیالی کا شکار ہیں کہ دین کی اتباع کئے بغیر اور حجتِ خدا کی ولایت کے سائے سے باہر نکل کر اطمینان اور اخلاص کی حالت کو حاصل کیا جا سکتا ہے،

ان کا انجام حتماً ضلالت اور اغوائے شیطانی ہے۔

اس مقام پر ایک بنیادی نکتہ کو ملحوظ خاطر رکھنا بیحد ضروری ہے اور وہ یہ کہ صاحبانِ اخلاص کے دو درجات ہیں پہلی منزل پر وہ حضرات ہیں جو اپنی بندگی اور نیک اعمال کو انجام دیتے ہوئے صفاتِ حسنہ کے حصول کے ذریعہ سے اپنے نفوس کو اللہ کے لئے خالص کر لیتے ہیں اور اس سے بالاتر (اور یہ خدا ہی علم رکھتا ہے کہ ان دو درجات میں کتنا تفاوت ہے) وہ بندے ہیں جنہیں اللہ اپنے لئے خالص کر لیتا ہے؛ یعنی مصطفیٰ اور مجتبیٰ بندگانِ الٰہی !! پہلے درجے والے حضرات کو **مُخْلِصین** اور دوسرے اور بالاتر درجہ والے حضرات کو **مُخْلَصین** کے نام یا صفت سے یاد کیا گیا ہے۔ **مُخْلَصین** کے حوالے سے مزید وضاحت انشاءاللہ آگے بیان ہوگی۔

پس نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ملکوتی مقامات تک نفس کی ترقی جب ہی ممکن ہوتی ہے جب (۱) نفس غیر الٰہی اثرات سے اخلاص کو حاصل کر لے؛ اور (۲) اُس میں الٰہی صفات پیدا ہو جائیں۔ صفاتِ نفسانی کا الٰہی ہونا اِن معنوں میں سمجھا جا سکتا ہے کہ نفس میں پیدا ہونے والی صفات اسمائے الٰہیہ کی تجلیات ہوں اور صرف اور صرف معبودِ حقیقی سے مخصوص اور مربوط ہوں۔ جیسا کہ ایک صاف و شفاف آئینہ سورج کی شعاعوں کو reflect کر رہا ہوتا ہے۔ روشنی آئینہ کی نہیں ہوتی لیکن آئینہ ہی نورِ آفتاب کو منتشر کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ بندگی، تقویٰ اور زہد سے براہ راست مربوط مزید تین صفات ایمان، معرفت اور محبتِ حق ہیں۔ جب ایمان، معرفت، محبت اور عملِ صالح کی حسین اور پاکیزہ معجون نفس میں جذب ہو کر اپنا اثر دکھانا شروع کر دے، تو نفس غیر اللہ سے خالی اور اللہ کے لیے خالص ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ یا حالت ہے جب نفس یقین اور اطمینان کی منازل کو طے کر لیتا ہے، دنیوی رنج و حُزن اُسے شکستہ نہیں کر سکتے اور وہ شیطنت کے جال سے باہر نکل کر ملکوتی فضاؤں میں سانس لے رہا ہوتا ہے۔ اِس حالت کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب نفس ''صراط مستقیم'' پر آ چکا ہے۔ یعنی اُس شاہراہ پر جہاں کوئی فریبی اور راہزن موجود نہیں ہے، جس میں کسی قسم کی کجی اور خرابی نہیں پائی جاتی اور جس کا اختتام خود اللہ پر ہوتا ہے۔ یہ حقیقی اخلاص کا پہلا درجہ ہے لیکن ابھی بہت سا سفر باقی ہے!

مقامِ اخلاصِ اول کو پانے کے بعد یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ مطمئنہ، نفس کی انتہائی حالت کا نام نہیں ہے بلکہ درحقیقت مطمئن ہونے کے بعد نفس اس قابل ہو جاتا ہے کہ خود اللہ اُسے اپنی طرف لوٹنے کی دعوت دے۔ حالتِ اطمینان کا حصول اور اس سے اگلے مرحلے کے سیر و سلوک کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا سفر دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا ''**اِنا لِلّٰہ**'' اور دوسرا ''**الیہ راجعون**''۔ لہٰذا حالتِ اطمینان کو حاصل کر لینے کے بعد پہلا سلسلۂ سفر جو اس بنیاد پر مبنی ہے کہ ''ہم صرف اور صرف اللہ کے لیے ہیں'' مکمل ہو جاتا ہے اور پھر خود اللہ کی دعوت پر ''ہم اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں'' کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ مقامِ اخلاصِ عالی ہے جس کو **مُخْلَصین** کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

مُخْلَصین کے مرتبے پر فائز ہونے والے وہ منتخب شدہ نفوس ہیں جن کی عظمت کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: **سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الْمُخْلَصِیْنَ** (سورۃ صافات ۳۷۔ آیت ۱۵۹، ۱۶۰) یعنی اللہ کا وصف بیان کرنے کے کوئی قابل نہیں ہے، مگر اللہ کے **مُخْلَصْ** بندے۔ یہ وہ عالیشان نفوس ہیں جو اِس منزل پر فائز ہیں کہ تعریف و توصیفِ الٰہی کا حق ادا کر سکیں اور اِن کی مدح و ثنا بارگاہِ ایزدی میں درجۂ قبولیت بھی رکھتی ہے۔ اِس مرتبہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ مقامِ اخلاص پر پہنچ کر نفس دامِ ابلیس اور فریب ہائے شیاطین سے محفوظ، مامون اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ خود شیطان نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے: ''**قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ. اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ.**'' (سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۸۲، ۸۳) ترجمہ: تیری عزت کی قسم اِن سب (تمام اولادِ آدم) کو اغوا کروں گا مگر تیرے **مُخْلَص** بندے (وہ میری دسترس سے باہر ہیں)۔

جب اللہ نے بندے کے نفس کو اپنے دستِ لطف وعنایات میں سمیٹ لیا تو اب سفر کوشش اور ریاضت سے نہیں بلکہ جاذبہ الٰہی کی بنا پر طے پا رہا ہے۔ جیسے مقناطیسی میدان میں داخل ہونے کے بعد لوہے کے ٹکڑے کی حرکت اپنی محنت سے نہیں بلکہ مقناطیس کی کشش کی وجہ سے وجود میں آتی اور باقی رہتی ہے۔ اِس سیرِ الٰہی میں نفس جن منازل کو طے کرتا ہے اور جن احوال سے لطف اندوز اور بہرہ مند ہوتا ہے وہ ' راضیــه اور مرضیــه ' ہیں۔ یعنی حالتِ اطمینان کے بعد نفس حالتِ رضا کو پالیتا ہے اور انتہائے کمال یہ ہے کہ خود اللہ اُس سے خطاب کرے کہ ''میں تجھ سے راضی ہوگیا' اب میرے بندوں اور میری جنت میں داخل ہو جا''۔ اِس مقام پر ''عبادی'' اور ''جنتی'' کے الفاظ خصوصی توجہ کے مستحق ہیں جہاں خداوندِ علی واعلیٰ بندے اور جنت کو اپنی ذات سے نسبت عطا فرما رہا ہے۔ ایسے بندوں کا مرتبہ اور ایسی جنت کے خواص ہمارے تصور بلکہ وہم و گمان سے بھی بالاتر ہیں۔ اورحقیقت یہی ہے کہ مجھ عاصی وگنہگار کا قلم راضیه اور مرضیه جیسے احوال و مقامات کی تعریف وتشریح سے قاصر ہے۔ صاحبانِ فہم ونظر کی خدمت میں ایک ایسی حدیثِ معصومؑ پیش کر کے اِس موضوع سے رخصت ہو جائیں گے جو واقعاً عجیب مضامین پر مشتمل ہے اور اہل اللہ کے لیے بمنزلۂ کوثر وتسنیم۔

متنِ حدیث: درکتاب ''علل الشرائع''، ''مجالس''، و''خصال'' شیخ صدوق بہ طور مستند از یونس نقل شدہ کہ امام صادقؑ فرمود: **اِنَّ النّـاس یعبـدو ن اللّٰه علٰی ثَلٰثَةِ اَوُجه فطبقة یعبدونه رغبة فـی ثـوابـه فتـلک عبادةً الحرصاء و هوالطّمع!و آخرون یعبدونه خوفا من النّـارفتـلک عبـادة العبید و هِیَ رهبة!و لکنّی اعبده حُبًّا لَهُ. (عزوجل)فتلک عبـادة الکرام . [وهـوالامـن] لـقـولِـهٖ عـزّوجلّ.(و هُم مّن فزعٍ یومئذٍ آمنون) ولـقـولـه(عـزّوجـلّ)(قُـلُ اِنْ کُنُتُمُ تُحِبُّوُنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوُنِیُ یُحُبِبُکُمُ اللّٰهُ وَ یَغُفِرُ لَکُمُ ذُنُوُبَکُمُ)** (آل عمران۔۳۱) **فـمـن احب الله. عز وجل . احبه الله . و من احبه الله کان من الامنین و هذا مقام مکنون (لا یمسه الا المطهرون).**

[حوالہ: رسالۃ الولایۃ۔علامہ محمد حسین طباطبائی]

ترجمہ: امام صادقؑ نے فرمایا کہ انسان اللہ کی عبادت تین جہتوں پر کرتے ہیں۔ ایک طبقہ عبادت کرتا ہے اُس کے ثواب کی رغبت میں' یہ طمع یا لالچ ہے یعنی یہ عبادت، طمع ہے۔ دوسرا (طبقہ) آگ کے خوف سے اُس کی عبادت کرتا ہے' یہ غلاموں کی عبادت ہے اور اِس (عبادت) کو ترس و ہراس کہتے ہیں۔ لیکن میں (یعنی امامؑ خود) اُس کی بندگی کرتا ہوں اُس کی محبت کی بنیاد پر اور یہ صاحبانِ کرامت کی عبادت ہے [اور یہ امن ہے] قولِ خدائے عزوجل ہے کہ ''اس روز وہ لوگ خوف و ہراس سے امن میں ہوں گے۔'' اور اللہ نے فرمایا: ''اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری (یعنی رسول اللہؐ) اتباع کرو تو اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت فرمائے۔گا'' پس جو اللہ سے محبت کرتا ہے خدا اُسے محبوب رکھتا ہے اور جس سے اللہ محبت کرے وہ ''آمنین'' (امن حاصل کرنے والوں) میں سے ہوگیا۔ یہ مقامِ مکنون ہے جسے مَس نہیں کر سکتے مگر وہی جنہیں پاک (طاہر) کر دیا گیا ہے۔'' اختتامِ حدیث۔

اگر خدا توفیق عنایت فرمائے تو الفاظِ آمنین' مکنون اور مطہرون پر ضرور غور فرمایئے۔ قولِ امامؑ کے مطابق نفسِ انسانی کا پائیدار بلکہ ابدی اور دائمی حالتِ امن کو حاصل کر لینا اللہ کی محبت کے حصول پر منحصر ہے۔ اور سورہ آل عمران کی آیتِ کریمہ کا اعلان یہ ہے کہ محبتِ الٰہی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جبتک کہ رسول اللہ کی کامل اتباع اور پیروی نہ کی جائے۔

بابِ چہارم

حضرت آدمؑ اور نفسِ انسان

اس باب میں انشاءاللہ ہم کوشش کریں گے کہ قرآن کریم میں جنابِ ابوالبشر حضرت آدمؑ کے بیان کردہ واقعات کے حوالے سے نفسِ انسانی کی حقیقت پر کچھ روشنی ڈالیں۔ اِس جہتِ فکر کو پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کی ذات میں انسانی زندگی کی حقیقت' صفات' کیفیات بلکہ آغاز وانجام کا نچوڑ موجود ہے۔ لہٰذا اُن آیتوں پر غور کرنا جن میں قرآن نے حضرت آدمؑ کا تذکرہ فرمایا ہے خود معرفتِ نفسِ انسان اور حیاتِ انسان کے حوالے سے انتہائی افادیت کا حامل ہے۔ حضرت آدمؑ کا موضوع بذات خود ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے لیکن ہم کیونکہ ''نفس'' کی معرفت پر بات کر رہے ہیں لہٰذا تذکرۂ آدمؑ میں اپنے آپ کو صرف اُن نکات تک محدود رکھیں گے جو ہمارے اصل موضوع سے مطابقت رکھتے ہوں۔

میدانِ بحث میں وارد ہونے سے قبل ایک اہم ترین نکتہ کی وضاحت بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم نے حضرت آدمؑ کے واقعات کو ایک انوکھے انداز سے بیان فرمایا ہے جو دیگر انبیاء کی سیرت اور واقعات کے تذکرہ سے جداگانہ اسلوب کا حامل ہے۔ اس انداز کا اولاً ادراک کرنا کافی مشکل اور دقت طلب ہے اور اگر فہم وہاں تک پہونچ بھی جائے تو کسی اور کو سمجھانا اس سے بھی زیادہ دشوار۔ اسی وجہ سے جناب آدمؑ کے معاملہ میں اشتباہات سب سے زیادہ ہیں۔ بہرحال وہ یاد رکھنے والا نکتہ یہ ہے کہ جنابِ آدم وحوا کے بارے میں قرآن نے جتنی بھی گفتگو کی ہے ان میں سے کچھ بھی اِن دونوں کی حیاتِ دنیوی سے مربوط نہیں ہے یعنی ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا تعلق اس زندگی سے نہیں ہے جسے ہر انسان دنیائے مادّی میں گذارتا ہے بلکہ آب وگل سے تخلیق، علم اسماء کا عطا ہونا، ملائکہ کا سجدہ، بہشت میں داخلہ، وسوسہ شیطانی کا شکار ہونا اور آخر میں جنت سے زمین پر ہبوط یا اترنا؛ ان میں سے کوئی واقعہ دنیوی زندگی یا دارِ تکلیف میں پیش نہیں آیا بلکہ حقیقتاً قرآن نے آدم وحوا کی دنیاوی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کیا ہی نہیں ہے۔

اس بات کو بیان کرنے کی اہمیت کیا ہے اور ہم اس نکتہ پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟ بنیادی وجہ یہ کہ دنیا عالمِ تکلیف اور ابتلا وآزمائش ہے اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے اللہ کے محکم قوانین موجود ہیں جن کی پاسداری پر اجر وثواب ہے اور جن کی مخالفت معصیت اور گناہ۔ دشواری یوں آن پڑتی ہے کہ جب ہم حضرت آدمؑ کے واقعات پر غور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اپنے محدود تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر انہیں دنیوی زندگی کے معیارات پر ہی پرکھنا شروع کر دیتے ہیں یعنی آدم نے درخت کو چکھا جس کے قریب جانے سے اُن کو اللہ نے منع فرمایا تھا تو اُن سے معصیت سرزد ہوئی اور نتیجۃً وہ نعوذ باللہ، گنہگار ہو گئے یا ملائکہ کے سجدہ کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ آدم کو وہ کمال نصیب ہو گیا جو ایک مومن تمام آزمائشات سے کامیابی سے گذرنے اور اُن مراحل میں سرخرو ہونے کے بعد آخرت میں حاصل کریگا۔ اور جب آدمؑ اوجِ کمال پر پہونچ گئے تو پھر شیطانی وسوسہ ان پر کیونکر اثر انداز ہو سکا؟؛ اور ایسے ہی دیگر معاملات۔ لیکن اگر ہم اِس تنبیہ کو ملحوظ خاطر رکھیں کہ مذکورہ تمام واقعات آدم وحوا کے دنیا میں وارد ہونے سے قبل رونما ہوئے تو گناہ اور ثواب کا حساب کرنے کے بجائے ہم اس امر پر توجہ کو مرکوز رکھیں گے کہ آدم وحوا کے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات کے وسیلہ سے اللہ نے آنے والی انسانیت یا نسل آدم پر نہ صرف ان کے نفس کی حقیقت کو روشن فرمایا ہے بلکہ یہ وضاحت بھی فرما دی کہ نفس کا ارتقا اور کمال کس بنا پر حاصل ہوگا اور نفس کے لئے خطرات ودشواریاں کن مقامات پر موجود ہیں۔ اِس روشِ فکری کو طے کرنے کی صورت میں آیتوں کے اندر موجود معارف کو درک کرنا بھی آسان ہو جائے گا اور مفید مطالب بھی نصیبِ جان ہو سکیں گے۔ لیکن بہرحال یہ قرآن ہے جو بالاترین عقل کے واسطے بھی ایک چیلنج ہے لہٰذا یہ سمجھ لینا کہ ہم غور وفکر کے نتیجہ میں سب کچھ جان گئے پرلے درجہ کی حماقت ہے اور ہم ایسا

کوئی دعوٰی کرنا پسند بھی نہیں کرتے۔

(الف) نفسِ آدمؑ تمام انسانی نفوس کی اصل ہے: پروردگار عالمین نے قرآنِ کریم میں چند مقامات پر ارشاد فرمایا ہے کہ: **خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ.** (سورۂ نساء۴۔آیت ا سورۂ زمر ۳۹۔آیت ۶) یعنی ''ہم نے تم کو نفسِ واحد سے خلق کیا۔ یہاں پر کُمْ سے مراد تمام انسان ہیں اور ''نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' کے الفاظ حضرت آدمؑ کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔یعنی تمام انسانوں کے نفوس کی جڑیں نفسِ آدمؑ سے جاملتی ہیں۔پس اگر ہم نفسِ آدمؑ کے بارے میں اساسی حقائق کو اچھی طرح جان لیں تو نہ صرف خود اپنے نفس کی بہتر معرفت حاصل ہو سکے گی بلکہ بالعموم نفسِ انسان کے بارے میں بھی مفید معلومات اخذ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔قرآن کا یہ انداز ایسی کسی بھی شے کی حقیقت کو آشکار اور بیّن کرنے کی بہترین روش ہے جو موجودِ واحد نہ ہو بلکہ ایک نوعی وحدت ہو جیسے کہ آدم سے وجود میں آنے والی انسانیت۔تو اسلوب یہ ہے کہ Original Design کی خصوصیات کو واضح کر دیا جائے تا کہ اُس میزان پر بننے والی تمام products کی خامیاں، خوبیاں اور مسائل و خصائل بآسانی اور بخوبی روشن ہو جائیں۔

(ب) ہر انسانی نفس آدمؑ جیسی صلاحیت کا حامل ہے: اگرچہ اپنی خلقت و آفرینش کے اعتبار سے نفسِ آدمؑ منفرد اور یکتا ہے لیکن تمام انسانی نفوس کی ساخت اسی نفسِ اوّل کی ترکیب و تدبیر سے اخذ کی گئی ہے۔یعنی حضرت آدمؑ کے نفس کی جو صفات، خصوصیات اور اہلیت ہے وہ تمام انسانوں کے نفوس کے لیے بھی مہیا اور موجود ہے۔ یہاں اِس نکتے کو اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں کہ زور ''صلاحیت و اہلیت'' پر ہے نہ کہ عطا و سونپ دئے جانے پر۔[اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے بھی آئے گی] خلقتِ وجودِ انسانی کی یہ اصل کہ'' ہر انسان مثلِ وجودِ آدمؑ خلق نہیں ہوتا'' ہمیں شک و شبہ کا شکار نہ کر دے۔یعنی کہیں ہم یہ نہ سمجھنا شروع کر دیں کہ وہ سب کچھ جس کا ذکر حضرت آدمؑ کی خلقت کے ساتھ بیان ہوا جس میں اہم ترین علمِ اسمائے کُل کا عطا ہونا ہے وہ نعمتِ عظمیٰ ہمیں بھی پیدائشی طور پر حاصل ہو چکی ہے۔ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر نفس ان صلاحیتوں (Potential) کے ساتھ معرضِ وجود میں آتا ہے جن کے بل بوتے پر حضرت آدمؑ یعنی انسانیت کیلئے مہیا ممکنہ کمالات کو حاصل کر سکے، وہ کمالات جن کی اصل و اساس علمِ اسمائے الٰہیہ کا حامل ہونا ہے۔

(ج) نفسِ آدم جسم اور روح کا ملاپ ہے: نفسِ آدمؑ بلکہ وجودِ آدمؑ کی ظاہری خلقت اگرچہ مٹی اور پانی سے ہوئی **(و اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّي خالق'' بَشَراً مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ)**(سورة حجر . آیت ۲۸) ترجمہ: اور جب تیرے رَبْ نے ملائکہ سے کہا: میں خلق کرتا ہوں بشر کو ایسی خاک سے جو (سوکھی ہوئی کیچڑ ہے) (یعنی) مٹّی اور پانی کو باہم ملا دینے کے بعد خشک ہو چکی ہو۔ آب و گِل کے مجموعہ سے تخلیق فقط آدم کے وجود کا جسمانی پہلو ہے لہٰذا آدم کی خلقت کا معاملہ اس مقام پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ جسم کو معتدل (Balanced) حالت میں خلق کرنے کے بعد اللہ نے اِسی پیکرِ مادّی میں ایک غیر مادّی اور مجرد جوہر یعنی روح کو پھونک دیا۔جیسا کہ اگلی آیت میں ارشاد ہو رہا ہے: **(فَاِذا سَوَّيْتُهُ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي فقعو له سٰجدين)**(سورة حجر . آیت ۲۹) یعنی جب میں (اللہ) پیکرِ آدم کو (جسمانی طور پر) درست کرنے کے بعد اُس میں اپنی روح کو پھونک دوں تو اے فرشتوں تم سب اُس کے لئے سجدہ گزار ہو جانا۔پس وجودِ آدمؑ مٹّی اور پانی سے خلق کئے گئے جسم اور اُس جسم میں روحِ الٰہی کے نفوذ کا ماحصل ہے۔ بالفاظ دیگر بظاہر دو جداگانہ حقیقتوں یعنی جسم و روح کے ملاپ سے نفسِ آدم وجود میں آیا۔اِس محیر العقول ملاپ کی اصل نوعیت کے بارے میں ہمارا فہم بہت حد تک لاعلم ہے ۔ **و ما اُوتيتم من العلم الّا قليلا** (سورة بنی اسرائیل ۱۷ . آیت ۸۵) ترجمہ: اور تمہیں (اس) علم میں سے بہت تھوڑا عطا کیا گیا ہے۔

(د) آدمؑ میں پھونکی گئی روح براہ راست اللہ سے وابستہ ہے: آدمؑ کی کرامت کی بنا وہ روح ہے جسے اللہ نے روحی کی شرافت عطا فرمائی ہے۔ پیکرِ آدمؑ میں دَم کی جانے والی روح کو اللہِ علی واعلیٰ کا اپنی ذات سے نسبت دینا (رُوح + ی) خود نفسِ آدمؑ کی معرفت کے حوالے سے عجیب ابعاد کا حامل ہے۔ غور کریں کہ یہاں پر 'روح' یا 'روحنا' کے الفاظ نہیں استعمال ہو رہے بلکہ 'روحی' یعنی میری روح۔ اللہ روح کی نسبت اپنی ذات سے دے رہا ہے جیسے کہ 'عبادی' اور 'جنتی' جیسے الفاظ جن کا تذکرہ ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ اس طرزِ بیان میں کیا رمز پوشیدہ ہے؟ غور کریں تو واضح ہوگا کہ پیدا کرنے والے کا پیغام یہ ہے کہ ''میں آدمؑ اور اُس کے وسیلے سے اولادِ آدمؑ کو وہ جوہر اور صلاحیت عطا کر رہا ہوں جس کو ترقی دے کر وہ مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس پھونکے جانی والی روح کا تعلق مجھ سے ہے اور نفسِ آدم اسی روح کے وسیلے سے مجھ سے وابستہ اور متعلق ہوتا ہے اور اسی روح کو ترقی دے کر میرے ان جلوؤں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جہاں کسی اور مخلوق کی رسائی ممکن نہیں''۔ یہ وہی ارتقا ہے جس کی مثال ہمیں انبیائے اولوالعزم اور خاص طور پر معراجِ پیغمبر اکرمؐ میں دکھائی دیتی ہے۔

(ھ) آدمؑ کا کمال علمِ اسمائے کُل میں پوشیدہ ہے: آدمؑ کے لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ''اللہ نے آدم کو تمام اسماء کا علم عطا کیا۔ (عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا)(سورۃ بقرہ . آیت ۳۱). یہ اعطا انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ علمِ اسماء کے حامل ہونے کا مظاہرہ کرنے کے بعد ہی تمام فرشتوں نے بحکمِ خدا آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو قبول کیا۔ آدمؑ علمِ اسماء پر کب حاوی ہوئے؟ جب اُن کے پیکر اور قالب میں روحِ الٰہی پھونک دی گئی۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ نفس کا ارتقاء اور کمال علمِ اسمائے الٰہیہ سے عبارت ہے جس کے حصول کے بعد نفس مسجودِ ملائک بن جاتا ہے اور یہ علمِ اسماء بغیر تائید واستمداد رُوحِ الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہاں محترم قارئین کے اذہانِ عالیہ میں یہ سوال ضرور بے چینی پیدا کر رہا ہوگا کہ اسمائے کُل کا عالم ہونے سے کیا مراد ہے اور اِس میں ایسی کون سی فضیلت ہے جس کے آگے تمام فرشتے جھکنے کے لیے آمادہ اور تیار ہیں؟ اِس بارے میں مختصر بیان جو ہمارے استفسار کی کفایت کرسکتا ہے وہ یہ کہ ہر اسْمِ الٰہی کائنات میں موجود ایک قوت اور حقیقت کا نمائندہ ہے جیسے اسمِ خالق کے ذیل میں تمام نظامِ تخلیق اور اسمِ رازق کے سائے میں تقسیم وترسیلِ رزق کا control موجود ہوگا۔ لہٰذا جو انسان جس اسم کا عالم ہوگا اُس اسم کے ماتحت قوتوں پر تصرف کرنے کی اہلیت کا حاصل کرلے گا جیسے کہ قرآن نے سورۃ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے وصی (حضرت آصف بن برخیا) کی کرامت کو بیان فرمایا ہے کہ انہوں نے پلک جھپکنے کے وقفہ سے بھی کم مدت میں تختِ بلقیس کو یمن سے فلسطین منگوالیا اور ایسا کر سکنے کی بنیاد یہ تھی کہ آنجناب کے پاس ''کتاب'' میں سے کچھ علم تھا (تفصیل کے لئے سورۃ نمل آیت ۴۰ ملاحظہ فرمائیں) پس اِس تعریف کے تحت حقیقی کتاب اسمائے الٰہیہ کے مجموعہ کا نام ہے۔

(و)۔ آدم اور نفسِ انسان کی کمزوریاں: اللہ نے کتابِ مبین میں صرف آدمؑ کی تعریف اور فضیلت ہی بیان نہیں فرمائی بلکہ آدمؑ کی کچھ کمزوریوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے اور لازمی طور پر یہ وہ خامیاں ہیں جو آدمؑ کے نفس سے خلق ہونے والے تمام انسانی نفوس میں بھی پائی جاتی ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے: **''وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِىَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا.''** (سورۂ طٰہٰ ۲۰. آیت ۱۱۵) اس آیتِ مبارکہ میں آدمؑ کی دو کمزوریوں کی جانب نشاندہی کرائی گئی ہے پہلی ''نسیان اور بھول'' اور دوسری ''عزم اور پختگی کا نہ ہونا''۔ نسیان، یعنی یاد کر کے یا یادشدہ حقیقت کو بھول جانا۔ نسیان کی حالت غفلت کے مرض کو ایجاد کرتی ہے۔ اسی طریقہ سے عزم و پختہ ارادے کی عدم موجودگی یا کمزوری نفس کو حق پر استقامت سے باز رکھتی ہے۔ کیونکہ انسان کا نفس، نفسِ آدمؑ سے خلق ہوا ہے لہٰذا نفسِ آدمؑ میں پائی جانی والی کمزوریاں نفس کی ''بنیادی'' خامیوں میں شمار ہوں گی اور نفس اگر ترقی کا خواہاں ہے تو سب سے پہلے اِن کمزوریوں پر قابو پانا ہوگا۔ جیسا کہ خود حضرت آدمؑ کے واقعات سے ثابت ہے کہ اِن ہی کمزوریوں کی وجہ

سے وہ اور اُن کی زوجہ وسوسۂ شیطانی کا شکار بنے جس کا نتیجہ بہشت (برزخی) سے خروج اور زمینِ مادّی پر ھبوط کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(ز) **آدمؑ کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے:** ابلیس، آدمؑ سے حسد کا شکار ہونے کے بعد آدم اور اُن کی نسل کے لئے قَسَمْ کھایا ہوا دشمن بن گیا۔ اب اس کی زندگی کا مقصد ہی اُن کو راہِ خدا سے دور کرنا بن گیا تا کہ یہ اسمائے کُل کے عالم نہ بن سکیں۔ سب سے پہلا وار اُس نے خود آدم وحوا پر کیا جب وہ ناصح بن کر ان دونوں کو فرمانِ الٰہی کی مخالفت پر آمادہ کرانے کے لئے میدان میں اُترا۔ اللہ نے اِغوائے شیطانی کے آدم وحوا پر اثر انداز ہونے اور درخت کے چکھے جانے کو معصیت سے تعبیر فرمایا: **و عصیٰ آدمُ ربّہٗ فغویٰ** (سورۂ طٰہٰ ۲۰ . آیت ۱۲۱) کلامِ الٰہی کا معنی یہ ہے کہ آدمؑ سے اُس وقت معصیت سرزد ہوئی جب انہوں نے شیطان کے وسوسے کو قبول کر لیا اور اللہ کے امر کو فراموش کر دیا جس کے نتیجہ میں وہ اغوا ہو گئے یعنی اپنے ہدفِ زندگانی سے منحرف ہو گئے۔ لیکن یہ فراموش نہ ہونے پائے کہ کیونکہ ابھی آدمؑ کی دنیا میں زندگی کا آغاز نہیں ہوا اور احکاماتِ شریعت ابھی اُن کی ذات پر لاگو نہیں ہوئے تو یہاں 'معصیت' کا معنی حُکمِ شریعت کے مقابلے میں گناہ نہیں لیا جائے گا بلکہ ارشادِ الٰہی (اللہ کی نصیحت) کی نافرمانی مراد ہوگا۔ اِس مقام پر قرآن نے حضرت آدمؑ کو مثال بناتے ہوئے نفسِ انسانی کی تیسری اہم ترین جہت کو واضح فرمایا اور وہ ہے معصیت اور اِغوائے شیطان کے بعد حق کے راستے کی جانب لوٹنا اور پلٹنا۔ جنابِ آدم وحوا نے جیسے ہی اپنے سقوط کو ملاحظہ کیا تو ابلیس کی مانند استکبار کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ کامل ندامت اور عاجزی کے ساتھ اللہ کی مغفرت ورحمت کی جانب رجوع کیا جیسا کہ سورۃ اعراف میں بیان ہوا: **قالا ربّنا ظَلمنا انفسنا فاِنْ لَّم تَغْفِر لنا و تَرْحمنالنکونَنَّ من الخاسرین** (سورۃ اعراف ۷ ۔آیت ۲۳) ترجمہ: دونوں نے کہا، اے ہمارے رب ہمارے نفوس نے ظلم کیا پس اگر تو ہمارے لئے اپنی مغفرت کا دامن نہ پھیلائے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو حتماً ہم خسارے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ جہالت کا شکار ہو کر راہ سے بھٹک جانے کے بعد فوراً اللہ کی مغفرت ورحمت کی طرف رجوع کرنے کا نام ''توبہ'' ہے۔ اور قرآن نے حضرت آدم کو ہی مثال بناتے ہوئے یہ حقیقت بھی افشا کر دی کہ یہ طلب رَدّ نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ توبہ کے بعد اللہ نے آدمؑ کو برگزیدہ کر لیا اور اپنے منتخب بندوں میں شامل فرمایا اور اپنی بارگاہ سے ہدایت بھی عنایت فرمائی۔ **ثُمَّ اجتبٰہُ ربُّہُ فتابَ علیہ و ھدیٰ** (سورۂ طٰہٰ . آیت ۱۲۲) اللہ کی مغفرت ورحمت سے استفادہ کرتے ہوئے آدم ''صفی اللہ'' کے مقام پر بھی فائز ہوئے اور اپنی کھوئی ہوئی جنت کو بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

پس اگر نفس ترقی چاہتا ہے تو اوّلین مرحلے پر غفلت ونسیان کا علاج ذکرِ الٰہی سے اور عزم کی کمزوری کا مداوا بندگی اور عبادات پر استقامت سے کرے اور اگر وسوسہ شیطانی کا شکار ہو جائے تو معصیت پر اصرار ہرگز نہ کرے بلکہ عاجزی واعترافِ گناہ کے ساتھ طلبِ رحمتِ پروردگار اور استغفار کو شعار کے طور پر اختیار کرے تا کہ مقصدِ خلقت یعنی حصولِ خلافتِ الٰہیہ کی تکمیل ممکن ہو سکے اور بہشتِ جاوداں کی دائمی نعمتیں اُس کا مقدر بن جائیں۔

(ح) **نفخہ روحِ خدا کے باوجود نفس گمراہی کا شکار کیوں؟:** آخری مرحلہ میں حضرت آدمؑ اور نفسِ انسان کے حوالے سے اہم ترین سوال بلکہ اشکال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ سوال یہ ہے کہ ''قرآن کا فرمان ہے کہ ہم نے آدم میں اپنی روح کو پھونکا۔ یعنی **وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِی** ۔ یہ روح اِس قدر بلند مرتبت ہے کہ ایک طرف تو خدا سے براہِ راست نسبت رکھتی ہے اور دوسری جانب حضرت آدمؑ کو مسجودِ ملائک بننے کی اہلیت عطا کرتی ہے۔ آدمؑ کے صلب سے پیدا ہونے والے افراد بھی اس روح سے بہرہ مند ہیں لیکن اِس کے باوجود ابنائے آدمؑ کی اکثریت میں نہ تو غیر معمولی علم نظر آتا ہے اور نہ ہی اللہ سے کوئی حقیقی تعلق بلکہ کثیر تعداد میں انسان فسق وفجور میں مبتلا اور اپنے مقصدِ خلقت سے جاہل اور غافل دکھائی دیتے ہیں۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

خدا کی جانب سے پھونکی جانے والی روح نفسِ انسانی کو علم اور ہدایت دینے سے کیوں قاصر ہے اور روحِ الٰہی کی موجودگی کے باوجود نفس شیطنت اور حیوانیت کے دام ہائے پُرفریب کا اسیر کیوں ہے؟'' سچ پوچھیے تو بحث اب پُلِ صراط پر آن پہنچی ہے۔یعنی بال سے زیادہ باریک' آگ سے بڑھ کر گرم اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز۔اللہ اِس مرحلے کو کامیابی سے طے کرنے میں ہماری رہنمائی فرمائے۔

اس مرحلۂ فکر پر جو امر سب سے زیادہ جالبِ نظر اور لائقِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ''وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي'' کا تذکرہ صرف حضرت آدمؑ کے لیے کیا ہے۔قرآن کریم میں کئی مرتبہ عام انسانوں کی خلقت اور پیدائش کا ذکر بھی آیا ہے لیکن کہیں بھی یہ بیان مشاہدہ میں نہیں آتا کہ ہم نے انسانوں میں اپنی روح کو پھونکا ہے۔ یہ نکتہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور ذہنوں میں اچھی طرح محفوظ رہے تاکہ ہمیں مطلوبہ نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔لیکن اِس مقام پر پہنچ کر گفتگو اور گمبھیر ہو جاتی ہے کیونکہ اگر ایسا ہے تو پھر انسانوں میں کیا روح نہیں ہے؟ کیا انسان غیر مادّی پہلو نہیں رکھتے؟ قرآنِ کریم نے حضرت آدمؑ اور نسلِ آدم کی خلقت میں پہلا تو یہ بنیادی فرق واضح فرمایا ہے کہ آدم کی خلقت کی بنیاد خاک ہے جو مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی پیکرِ آدمؑ کی خلقت کا وسیلہ بنی لیکن تمام انسانوں کی خلقت کا وسیلہ ایک قطرۂ آب ہے جس کا نام نطفہ ہے۔ اس کے علاوہ آدمؑ کی غیر مادّی جہت کی بنیاد ''نفخہ روحِ خدا'' ہے جبکہ عمومِ انسانیت کے غیر مادّی اور مجرد پہلو کی اساس تین صفات ہیں: اوّل، سمع؛ دوسرے، بصر اور تیسرے، افئدۃ۔ یعنی سننے اور غور کرنے کی صلاحیت' دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کی قوت اور ایک پرجوش اور حرارت والا قلب؛ تو کیا روحِ خدا کا مطلب سمع و بصر اور فؤاد ہیں؟ معرفت کی اس جہت کو درک کرنے کے لئے بہت دقت درکار ہے۔کوشش کرتے ہیں کہ فکر کو مرحلہ وار اس دشوار راہ سے باہر نکالیں۔

قرآنی نقطہ نظر سے اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے سورۂ سجدہ کی آیات ۷ تا ۹ میں غور و فکر لازمی اور کافی ہے۔ارشادِ رب العزت ہے:

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ: ''وہی (عزیز و رحیم) ہے جس نے ہر شئے کو احسن انداز سے خلق فرمایا اور انسان کی خلقت مٹی سے قرار دی۔ پھر اس کی نسل کو ایک بے وقعت پانی (یعنی نطفے) کے خلاصے میں سے قرار دیا۔ پھر اُس کو درست کیا اور اُس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے لیے سمع' بصر اور افئدۃ بنائے۔تم لوگ کتنا کم شکر ادا کرتے ہو۔''

قرآنِ کریم میں شاید یہ واحد مقام ہے جہاں اللہ نے حضرت آدمؑ اور اُن کی اولاد یا نسل کی خلقت کو پہلو بہ پہلو بیان فرمایا ہے اور اِن آیات میں باریک بینی کے ساتھ غور کرنے سے ہمیں اپنے سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کی خلقت کی ابتدا ''طین'' یعنی خاک سے کی' پھر اُس کی نسل کو ایک حقیر قطرۂ آب یعنی نطفے سے جاری کیا۔غور فرمائیے کہ وہ انسان جس کے وجود کی خلقت مٹی سے ہوئی ہے وہ سوائے حضرت آدمؑ کے اور کوئی بھی نہیں ہے۔جس طرح سے ان دو آیتوں میں آدمؑ اور اُن کی نسل کی ظاہری اور مادّی خلقت کی مختلف کیفیتوں کا ذکر فرمایا ہے اُسی طرز پر اگلی آیت میں آدمؑ اور اُن کی اولاد کے نفس میں پائے جانے والے غیر مادّی پہلوؤں کا تذکرہ بھی دو مختلف حوالوں سے کیا گیا ہے۔یعنی پیکرِ آدمؑ کو مٹی سے بنانے اور درست کرنے کے بعد اُس میں اپنی روح کو پھونکا اور نسلِ آدمؑ کی خلقت کو **ماء مهين** یا نطفے سے قرار دینے کے بعد اُسے **سمع' بصر اور فؤاد** عنایت فرمائے۔اس مقام پر

بدقت سَوّٰہ اور جَعَلَ لَکُم کے الفاظ میں موجود واحد اور جمع کے صیغوں میں فرق بھی ملاحظہ فرمائیں۔ یعنی جس ہستی میں روح کو نفخ کیا جا رہا ہے وہ واحد مذکر ہے اور جنہیں **سمع و بصر اور فوئاد** سے نوازا جا رہا ہے وہ جمع مذکر ہیں۔ اِس فرق کی مزید وضاحت کے لئے سورۂ حجر کی آیت نمبر ۲۹ اور سورۂ نحل کی آیت نمبر ۷۸ کو آمنے سامنے رکھ کر غور فرمائیں' مطلب انشاءاللہ واضح ہو جائے گا۔ سورۃ حجر میں اللہ آدمؑ کے پیکر کو درست کرنے کے بعد اُس میں اپنی روح کے پھونکے جانے کا ذکر کر رہا ہے جبکہ سورہ نحل میں ارشاد ہو رہا ہے کہ انسانوں کی خلقت براہ راست 'طین' سے نہیں بلکہ وہ اپنی ماؤں کے شکم میں پرورش پاتے ہیں اور اِس حالت میں نہیں باہر نکلتے کہ اُن میں روحِ الٰہی دمیدہ ہوتی ہے بلکہ وہ " **لا تعلمون شیئا** " کی حالت میں متولد ہوتے ہیں لیکن **سمع ، بصر اور فوئاد** کی نعمتوں کے ہمراہ۔

اگر ہم آدمؑ میں پھونکی جانے والی روح کو خدا کے ساتھ رابطہ اور تعلق کا ذریعہ سمجھیں' تو نتیجہ یوں نکلے گا کہ آدمؑ خدا کے ساتھ ذاتی تعلق اور ماورائے مادّہ زندگی کے شعور کے ساتھ خلق ہوئے اور باقی سارے انسان (کچھ استثناء کے ساتھ) اُن کمالات کو حاصل کرنے کی صلاحیت اور Potential کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ مخصوص انسانوں کو فضیلت اور کرامتِ روحانی کیوں حاصل ہے اور روحِ الٰہی کے حاصل ہونے اور اسے حاصل کرنے کی صلاحیت کے ساتھ پیدا ہونے میں فرق کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس کی تفصیل میں جانا تو اس مقام اور موضوع کی مناسبت سے ممکن نہیں ہے لیکن اس حقیقت کا سمجھنا بھی کافی ہے کہ قرآن کی زبان میں کچھ انسان اللہ کے منتخب کردہ اور مصطفٰی بندے ہیں جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۳۳ میں ارشاد ہوتا ہے: **اِنَّ اللہَ اصْطفٰی آدمَ و نوحاً و آل عمران علی العالمین** • اس آیۃ کریمہ میں اللہ آدمؑ کو مصطفٰی یعنی چُنے ہوئے اور برگزیدہ بندوں میں شمار فرما رہا ہے۔ اسی طرح اگر انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وارد ہونے والی آیتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ حضرات ابتدائے حیات سے ہی مشاہدہ ملکوت اور روح قدس کی تائید سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور انہیں اپنی ذات میں، جسمانی ولادت کے بعد، روحِ الٰہی کو درک کرنے اور اس جہتِ حیات کو activate کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بالفاظ دیگر وہ عام انسانوں کی مانند جہل یا **لا تعلمون شئیاً** کی سرحد سے اپنی حیات کا آغاز نہیں کرتے۔

سورۂ مومنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ اِس حقیقت کی مزید وضاحت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جہاں انسان کی خلقت کے مراحل کو تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے' ارشادِ احسن الخالقین ہے:

"وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ. ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ. ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ."

ترجمہ: ''اور بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے خلق کیا پھر اُسے ایک ٹھہرے ہوئے مکان میں نطفہ بنا کر رکھا' پھر اُس نطفے کو جما ہوا خون بنایا' پھر اُس منجمد خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا' لوتھڑے کو ہڈیوں کی خلقت دی اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر ہم نے اُسے ایک اور خلقت میں اٹھایا۔ پس اللہ جو احسن الخالقین ہے صاحبِ برکت ہے۔''

غور فرمائیے کہ ان آیتوں میں انسان کی جسمانی خلقت کے مختلف مراحل کو بیان کرنے کے بعد جب انسان کے مجرد پہلو کا تذکرہ آیا تو حضرت آدمؑ کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے اُس پیکرِ مادّی میں روح کو پھونک دیا' بلکہ یہ فرمایا کہ اُسے ایک اور طرح کی خلقت عطا کر دی۔ یعنی اُسے **سمع' بصر اور فئواد** عطا کر دیے جن کی مدد سے وہ اُس روح کو حاصل کر سکتا ہے جو انسانیت کے فردِ اوّل یعنی حضرت آدمؑ کو عطا ہوئی تھی اور جس کی تائید سے وہ علمِ اسماء پر حاوی ہو

کر مسجودِ ملائک بن گئے۔ اور اس روحِ امری کے انبیاء اور ائمّہ علیہم السلام حامل ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے حصول کے حوالے سے راہبر اور راہنما بھی ہیں۔

اگر استدلال کی یہ ترتیب و ترکیب ذہنوں میں واضح ہوگئی ہے تو ہم اپنے اٹھائے گئے سوال کا جواب یوں دے سکتے ہیں کہ خدا نے حضرت آدمؑ کو انسانِ اوّل ہی نہیں بلکہ انسانیت کے نمونے کے طور پر خلق فرمایا۔ نفسِ آدمؑ جسم اور روح کے ملاپ سے تیار ہوا۔ ایک پہلو یعنی جہت ِ روحانی اِس قدر ارفع اور اعلیٰ کہ عالمِ امکان کی تمام قوتیں اُسے سجدہ کریں اور دوسرا پہلو یعنی جسمِ مادّی شیطان کے پھینکے ہوئے وساوس کے تیروں کا شکار اور حیوانی شہوات کا اسیر۔ خدا نے آدمؑ کی شخصیت میں دونوں کا نمونہ دکھلا دیا اور سقوط سے اٹھ کر بلندیوں کی جانب سفر کا نسخہ بھی بتلا دیا۔ پس نفسِ آدمؑ نمونہ اور مثال ہے جو انسانیت کی رفعت' عظمت' تنزلی' سقوط' اور ترقی بعد از سقوط کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اِس نفس واحد سے خلق ہونے والے تمام نفوس جو نسلِ آدمؑ کی صورت میں اِس دنیا میں نمودار ہوئے وہ جسمِ مادّی کے ساتھ اور روحِ الٰہی و ملکوتی کو حاصل کرنے کی صلاحیت اور تعلق کے ہمراہ پیدا ہوتے ہیں نہ کہ روحِ خداوندی کی تائید کے ساتھ خلق ہوتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی کہ جیسے ایک Television کے نظام میں وہ سارے Electronic systems موجود ہوتے ہیں جو فضا میں موجود آوازوں اور مناظر کو Receive کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن Receiver کی موجودگی کا مطلب سکرین پر خود بخود آہنگ و تصاویر کا نمودار ہو جانا نہیں ہوتا بلکہ اُس کے لئے دیگر کئی شرائط درکار ہوتی ہیں۔ اسی طرح سمع، بصر اور فؤاد کا مطلب روحِ الٰہی کا حاصل ہونا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا Circuit اور Network ہے جس کا درست استعمال، نفس کیلئے روحِ امری سے وابستہ ہو جانے کو ممکن بنا دیتا ہے۔ لیکن پھر یاد رہے کہ اِس معاملہ میں اللہ کے مصطفیٰ اور مجتبیٰ بندوں کا نفس دیگر انسانوں سے ممتاز ہے۔ لہذا سمع و بصر و فؤاد کا ابتدائے خلقت میں عطا ہونا ہی وہ مرحلہ ہے جہاں پر نفس کے لیے اختیاری ترقی کے امکانات فراہم ہوتے ہیں اور جزا و سزا کے ابواب کھل جاتے ہیں؛ اگرچہ کہ رحمتِ الٰہی سِنّ بلوغت تک نفسِ انسانی کو سزا کے واسطے مکلّف نہیں قرار دیتی اور اُسے زندگی کا فہم حاصل کرنے کا تفصیلی موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر نفس اپنے اختیار سے بلندیوں کا سفر اختیار کرتا ہے تو اُسے روحِ ایمان عطا ہو جاتی ہے اور اگر اُس کا رخ پستیوں کی جانب ہو جاتا ہے تو روحِ امری و الٰہی سے ''تعلق'' منقطع ہو جاتا ہے اور شیطان و حیوان کی ہمراہی نصیب ہوتی ہے۔ [روحِ ایمان کے حوالے سے مزید تفصیلات انشاءاللہ اگلے باب میں بیان ہوں گی]۔

امید ہے کہ اِس تفصیلی وضاحت کے بعد یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ انسانوں کی اکثریت اِس لیے فسق و فجور کی جانب مائل ہے کہ اُن کے نفوس نے روحِ ملکوتی و الٰہی کے حصول کے امکانات کو ضائع اور برباد کر دیا اور اپنا تعلق صرف اور صرف جسمانیت سے جوڑ لیا۔ ایسا نہیں تھا کہ اُن میں روحِ ملکوتی ڈال دی گئی تھی اور وہ روح اُن کی ہدایت سے عاجز رہی اور شیطان کا وسوسہ اتنا حاوی ہو گیا کہ روحِ ملکوتی کے باوجود انسانوں کے نفوس گناہوں کی طرف مائل ہو گئے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان فطری ہدایت کی بنیاد پر اور ایک ایسے نفس کی شکل میں خلق ہوئے ہیں جسے دستِ قدرت نے سمع' بصر اور فؤاد جیسے آلات سے لیس کر دیا ہے یعنی بدن اور غیر مادّی توانائیوں کا یہ محیر العقول ملاپ جسے پروردگار نے اپنی خلقت کا شاہکار قرار دیا ہے۔ ان دو وسائل پر مستزاد اللہ نے اپنے مصطفےٰ بندوں کو بھی ہدایت اور رہبری کا وسیلہ بنا کر انسانوں کے درمیان مبعوث فرمایا۔ اب یہ اِن انسانوں کی ذمہ داری تھی کہ فطرت اور نفس کو دی گئی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے، انبیاء کی ولایت کو قبول کرتے اور اُس روح سے رابطہ پیدا کر لیتے جس کے حصول کے امکان کو اللہ نے حضرت آدمؑ کی مثال کے ذریعے سے اُن کے سامنے واضح کر دیا تھا اور جس سے وابستہ اور فیضیاب ہونا علمِ اسماء کے حصول کے لئے واجب ہے۔

باب پنجم

نفس اور روح میں فرق

اِس مقام پر پہنچ کر ہمارے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ کچھ روح کے بارے میں بھی عرض کریں تا کہ نفس اور روح کا فرق اچھی طرح سے سمجھ میں آ جائے۔ شاید یہ بات عجیب لگے کہ ہم نفس اور روح کا فرق سمجھانا چاہ رہے ہیں کیونکہ صرف عوام ہی نہیں بلکہ خاصے علمی حلقوں میں بھی یہ دونوں الفاظ Inter-change-able سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی روح اور نفس کا مطلب ایک ہی ہے اور وہ ہے انسان کے وجود کا غیر مادّی پہلو۔ کوئی شخص موت سے ہمکنار ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اِس کے جسم سے روح نکل گئی یا نفس دوسرے عالم میں منتقل ہوگیا۔ جملہ کچھ بھی ہو لیکن مطلب یہی ہوتا ہے کہ جسمِ انسانی یہیں رہ گیا اور اِس جسم کے اندر غیر مادّی وجود اگلے جہاں میں منتقل ہوگیا۔ لیکن اگر ہم اس امر کے قائل ہیں کہ قرآن کی آیتیں کاملاً غیر مبہم اور اپنے مقام پر ہر لفظ ایک نگینہ کی مانند ہے جس کی جگہ کوئی دوسرا جوہر Fit نہیں ہوسکتا؛ تو ہمارے لئے نفس اور روح کی علیحدہ حقیقتوں کا درک کر لینا زیادہ دشوار نہیں رہ جائیگا۔ ہم آنے والے صفحات میں کوشش کریں گے کہ گفتگو کو اُس مقام سے لے کر آگے چلیں جہاں عامۃ المسلمین کا فہم پایا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت فراموش نہ ہونے پائے کہ ماہیت کے لحاظ سے روح اور نفس میں بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ روح، مادّیت سے عاری اور ایک مجرّد جوہر ہے لیکن نفس ایک جہت جسمانی رکھتا ہے اور دوسری روحانی؛ جسمانی ہونے کی تعبیر بھی نفس کے لئے درست ہے اور روحانی ہونا بھی نفس کے واسطے ممکن ہے۔ جس جہت کی جانب نفس کی توجہ قوی ہوگی وہی بُعد (dimension) نفس میں ہویدا اور آشکار ہوگی اور نفس کی شناخت کی بنیاد بن جائے گی۔ اسی بنا پر آخرت میں انسانی نفوس حیوانیت سے لے کر ملکوتی صورتوں میں ظاہر ہوں گے۔

منطقہ استدلال میں وارد ہونے سے پہلے یہ حقیقت مدِنظر رہے کہ ہمارے لیے نفس اور روح کے فرق کی بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے اگر یہ بحث صرف لفظوں اور اصطلاحات کی حد میں رہ جائے۔ یعنی ہم اِس پر جدال کرتے رہیں کہ مرتے وقت جسم سے روح نکلتی ہے یا نفس، انسان روح کی وجہ سے چلتا پھرتا ہے یا نفس کی وجہ سے وغیرہ وغیرہ؛ بلکہ اِس بحث کے برپا کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اِن دو الفاظ کو مختلف معنوں میں اور علیحدہ نظریے کے تحت استعمال فرمایا ہے جسے اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو نہ صرف معرفتِ نفس میں نکھار پیدا ہوگا بلکہ نفس کی ترقی کے عملی امکانات بھی اچھی طرح روشن اور واضح ہو جائیں گے۔

روح کی بنیادی تعریف:

روح کے بارے میں اگر ہم کچھ سمجھنا اور جاننا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے روح کی درست تعریف بیان کرنا پڑے گی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ روح غیر مرئی بلکہ غیر محسوس ہے اور ایسی کسی شئے کی معرفت کے لیے ہم عقلاً اور فعلاً مجبور ہیں کہ زبانِ وحی پر تکیہ کریں کیونکہ انسانی عقل تجزیے اور تجربے کے جن مراحل سے گزر کر کسی شئے کی شناخت کے قابل ہوتی ہے وہ مواقع ہمیں روح کے حوالے سے میسر نہیں ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ روح کے تصور سے آشنائی الٰہی نمائندوں اور فلاسفہ کا عطیہ ہے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ بہرحال اگر ہم نفس اور روح کا فرق معلوم کرنا چاہتے ہیں اور نفس کی ترقی میں روح کے کردار کو سمجھ کر اُس سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو جیسا کہ ہم پہلے فطرت اور نفس کو قرآنِ کریم کی آیات کے ذیل میں سمجھ چکے ہیں اسی طریقے سے مطالب کو اخذ کرنے کے لیے آمادہ اور مستعد ہو جائیں یعنی ان آیتوں کا بغور مطالعہ کر لیں جن میں روح کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

لیکن قبل اِس کے کہ ہم آیاتِ قرآنی کی مدد سے روح کی تعریف کریں اور اُس کے اوصاف اور ماہیت کو زیرِ غور لائیں چند تمہیدی کلمات ضروری ہیں تا کہ ذہن اِس امر کی جانب متوجہ ہو جائے

کہ خود اُس کے (یعنی انسان کے) وجود میں ایک ایسی قوت موجود ہے جو جسم کے علاوہ ہے اور نفس کو اِس قابل بناتی ہے، اُسے وہ مواقع فراہم کرتی ہے جن کے ذریعے سے نفس عالمِ بالا سے متصل ہوسکتا ہے اور مادّیت کی قید سے نجات حاصل کرسکتا ہے۔ہم درخواست گزار ہیں کہ اِن تمہیدی کلمات کو اچھی طرح سمجھ لیں تا کہ روح کے ''عوامی'' تصور میں ایک درجہ بہتری آ جائے اور ذہن قرآنی مطالب کو سمجھنے کے لیے آمادہ اور مستعد ہوجائے۔

تمام جاندار مخلوقات (Living Things) میں ہم ایک ایسی قوت (Energy) کا مشاہدہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کو مخصوص صلاحیتیں اور اختیارات حاصل ہوجاتے ہیں جن کا مظاہرہ اُن کے اجسام کے ذریعے سے ہوتا ہے۔مثلاً نباتات میں ایک ایسی قوت موجود ہے جو بیج کو درخت بناتی ہے اور اُس میں پھل پھول پیدا کرتی ہے۔حیوانات اُس قوت کی مدد سے چلتے پھرتے، اپنے ماحول میں موجود اشیاء کا ادراک کرتے ہوئے، مفید اور پسندیدہ چیزوں سے لذت اٹھاتے اور ناپسندیدہ اشیا کو دفع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انسان اُس قوت کے وسیلے سے صرف حیوانات جیسے کام ہی نہیں کرتے بلکہ زندگی اور کائنات کے بارے میں تفکر اور تعقل کی صلاحیت کے بھی حامل ہیں۔یہ قوت جب انسانوں میں متحرک نظر آتی ہے تو اُنہیں کچھ ایسی صلاحیتیں عطا کرتی ہے جو کسی اور مخلوق میں نہیں پائی جاتی ہیں۔اِن میں سے خود اپنے آپ میں غور کرنے کی صلاحیت اور اِس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کہ میں جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہوں گا سب سے نمایاں اور لائقِ توجہ ہیں۔اِس حیات بخش قوت کا نام روح ہے۔روح اُس توانائی کا نام ہے جو نفسِ انسان کو علم، قدرت اور حیات جیسی نعمتیں عطا کرتی ہے، اور اُسے عالمِ ملک سے ترقی کرکے عالمِ ملکوت میں زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہے۔

اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال آئے کہ ہم روح کو جسم کا جزو کیوں نہیں مان رہے، تو اِس کا آسان جواب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب جسم میّت اور مردہ ہوجاتا ہے جو ثبوت ہے کہ جسم کسی قوت کی وجہ سے زندہ اور متحرک تھا لیکن انتقال کے بعد وہ قوّت اب جسم کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ پس اُس غیر مرئی اور بذاتِ خود جسمانیت سے پاک مُوثر کی موجودگی کے بغیر جسم کی زندگی ممکن ہی نہیں ہے۔ہم آسانی سے ثابت کرسکتے ہیں کہ وفات کے بعد جسم سے کوئی عضو کم نہیں ہوتا، جب تک مُردہ انسان کے جسم میں کیمیائی تبدیلی کا عمل شروع نہیں ہوتا، اُس وقت تک وزن میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔یعنی وزن کے تحفظ کا قانون (Law of conservation of mass) بھی معطل نہیں ہوتا۔حتیٰ یہ کہ اگر انسان کے دماغ (Brain) کا تجزیہ کیا جائے، تو کسی خلیہ کے بھی غائب اور ضائع ہونے کا نشان نہیں ملتا۔کیا فکر متوجہ نہیں ہوتی کہ وہ کون سی شئے ہے جو اگر جسم کے ہمراہ رہے تو انسان زندہ اور متحرک اور اگر جسم کو ترک کردے تو انسان مردہ اور مٹی میں دفن کردیے جانے کے قابل۔پس وہ قوت جو حیات کی موجودگی کا اصلی سبب ہے 'روح' کہلاتی ہے۔اِس کی مثال کو یوں سمجھ لیجیے جیسے روشنی کا بلب، جو اُس وقت تک روشن نہیں ہوتا جب تک اُس میں بجلی نہ دوڑ رہی ہو۔جیسے ہی آپ برقی رَو کا بٹن بند کردیتے ہیں بلب کا جسم کا ملاً بغیر کسی کمی اور نقص کے اپنی جگہ موجودہ رہتا ہے لیکن روشنی دینے کی صلاحیت سے محروم۔پس اِسی برقی رَو کو بلب کی روح سمجھ لیجیے۔

روح کی قرآنی معرفت:

یہ تو ہوا روح کا تعارف۔اگر یہ مقدماتی استدلال قارئین کے ذہنوں میں قبولیت پانے میں کامیاب ہوگیا تو اب ہم اِس قابل ہوگئے ہیں کہ روح کے بارے میں قرآنی نظریے پر غور کرسکیں۔''قرآن کی نظر میں روح صرف اُس قوت کا نام نہیں جو عالمِ مادّیت کی مخلوقات میں ابداء و انشاءِ حیات کا باعث ہے، بلکہ روح ایک عالی مرتبت حقیقت ہے، ایک مخلوق ہے جس کی تائید باذنِ خدا حاصل ہوجائے تو مادّیت کے اسفل السافلین سے نجات اور وحدانیت کے اعلیٰ علیین تک رسائی ممکن بلکہ سہل ہوجاتی ہے''۔روح کے حوالے سے قرآن کی یہ فراہم کردہ آگہی واقعتاً عجیب

اور تحیر آمیز ہے۔ کیونکہ زبانِ وحی کے علاوہ کسی اور زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ اِس انداز سے انسان کے لیے عوالمِ بالا کی راہوں کو کھول دے اور نفس کی ترقی کے اُن امکانات کو روشن کر دے جن کی منتہا معراج ہے۔

اب آیئے قرآنِ کریم کی آیات کے مطالعے سے روح کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ روح جس کا ذکر قرآن میں مکرّر آیا ہے اور انسان کے لئے اس کی تائید (جی تائید یا مدد) کا حصول ممکن ہے؛ روحِ امری یا ملکوتی کے عنوان سے یاد کی جاسکتی ہے اور یقیناً اُس روح سے جدا اور بالاتر ہے جسے ہم Energy of Life کی صورت میں جانتے اور پہچانتے ہیں۔

روح کے بارے میں نکاتِ تفسیری درجِ ذیل ہیں:

۱۔ روح کا تعلق عالمِ امر سے ہے کہ نہ عالمِ خلق سے۔ یہ روح کی حقیقت کے بارے میں قرآن کا کلیدی بیان اور بنیادی نظریہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

''قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا''

یعنی ''اے رسول کہہ دو کہ روح کا تعلق میرے رب کے امر سے ہے اور تمہیں اس کے بارے میں علم نہیں دیا گیا مگر جو قلیل ہے۔''

یہاں ضروری ہے کہ عالمِ خلق اور عالمِ امر کے درمیان فرق کو واضح کر دیا جائے۔ خلق کی خصوصیت درجہ بدرجہ' مرحلہ بمرحلہ (Gradual and stage-wise) آغاز سے انجام کی طرف پیش قدمی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۱۲' ۱۳' اور ۱۴ کو پیش کیا' جن میں Stage-Wise انسان کی خلقت کو نطفے سے مکمل جسم تک بیان کیا گیا ہے۔ ایسا ہی عالمِ خلق میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کا احوال ہے۔ انسان کے جسم کا تعلق عالمِ خلق سے ہے اور اُس پر اِن تمام قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جو اِس عالم کا خاصّہ ہیں۔ لیکن عالمِ امر کی کیفیت مختلف ہے۔ سورۂ یٰسین آیت نمبر ۸۲ میں ارشاد ہوتا ہے: ''اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ.'' ترجمہ: ''اُس (اللہ) کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شئے کے لیے ارادۂ کُن فرماتا ہے تو وہ (بلا وقفہ)، (باطن سے ظاہر) ہو جاتی ہے۔'' یعنی امر میں خلق کی مانند نقائص، رکاوٹیں، ثقل اور مراحل نہیں پائے جاتے؛ بلکہ عالمِ امر کی مخلوقات اِس درجہ کامل ہیں کہ ارادۂ الٰہی اِن میں فوری طور پر نفوذ کر کے ایک نتیجے کو حاصل کر لیتا ہے۔ اِس بات کا سمجھنا بہت اہم ہے کہ خدا کا قولِ کُن عالمِ امر میں کیوں فوراً اثر دکھاتا ہے جبکہ عالمِ خلق میں اثر برآمد تو ہوتا ہے لیکن کئی مراحل سے گزرنے کے بعد اور وہ بھی عیوب اور نقائص کے ہمراہ۔ وجہ صرف یہ ہے کہ عالمِ امر کامل ہے' اور عالمِ خلق ناقص۔ یہ درحقیقت وصول کرنے والے ظرف کی لیاقت اور اہلیّت کا نتیجہ ہے کہ عالمِ امر میں کلمۂ کُن کا اثر کامل اور فوری ہے' جبکہ عالمِ خلق میں بتدریج' مرحلہ وار اور مادّیت کی حدود و قیود میں گھرا ہوا۔ یہ فرق اگر سمجھ میں آ گیا تو یہ اسرار بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ روح وہ مخلوق ہے جو کامل ہے اور اللہ کی مشیّت و ارادے کو جذب کر کے فوری نتیجہ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے' جبکہ جسم ناقص اور ضعیف ہے اور مختلف مراحل سے ایک طویل مدت کے دوران گزر کر ہی ایک نتیجے کو حاصل کر سکتا ہے۔

۲۔ جو حقائق انبیا و رُسُل پر بطور وحی نازل ہوئے وہ درحقیقت اللہ سے وابستہ روح ہیں۔ سورۂ مومن آیت نمبر ۱۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: رَفِیۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الۡعَرۡشِ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ لِیُنۡذِرَ یَوۡمَ التَّلَاقِ. ترجمہ: جو بلند درجات والا اور مالکِ عرش ہے (وہی) القا کرتا ہے روح کو اپنے امر سے' اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے تاکہ وہ بندہ (لوگوں کو) ملاقات کے یوم سے ڈرائے۔ اِس کے علاوہ سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۵۲ میں پیغمبر اکرمؐ کے لیے فرمانِ خداوندی ہے: وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا . یعنی ''ہم نے تیری طرف وحی کیا روح کو جو ہمارے امر سے ہے۔''

یہ آیات روح کی عظمت' کمال اور حقیقت کو واضح طور سے بیان فرما رہی ہیں اور اس نکتہ کو

بھی روشن کر رہی ہیں کہ روح جسم اور جسمانیت سے جداگانہ ایک مستقل حیثیت اور صفات کی حامل ہے۔ یہاں پر یہ پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ روح کا انبیا پر القا ہونا اور بطور وحی بھیجا جانا دراصل انبیا اور رسل کو، جو اللہ کے منتخب بندے ہیں، عالمِ بالا کے حقائق سے روشناس کرانے کا سبب بن رہا ہے۔ وہ حقائق جن سے دوسرے افراد ناآشنا اور بے بہرہ ہیں۔

۳۔ روح، ملائکہ کے ہمراہ نازل ہونے والی حقیقت ہے اور امام باقرؑ کے قول کے مطابق ملائکہ سے افضل ہے۔ سورۂ نحل کی آیت نمبر۲ میں اللہ نے فرمایا: "**يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ .**" ترجمہ: "وہ اللہ نازل کرتا ہے ملائکہ کو روح کے ہمراہ جو اللہ کے امر سے ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہے۔" یہاں غور فرمایئے کہ اللہ کے منتخب بندوں پر ملائکہ بھی خوشخبری اور الٰہی پیغامات کے ساتھ اترتے ہیں اور اُن کے ساتھ ساتھ عالمِ امر سے تعلق رکھنے والی روح بھی نازل ہوتی ہے تاکہ اُنہیں حقائقِ بالاتر سے آگہی اور تعلق عطا کرے، باذن اللہ۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو خود قرآن سورۂ قدر میں بیان کر رہا ہے: **تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ .**

۴۔ روح سے تعلق نفسِ انسانی کو غیر معمولی عنایاتِ پروردگار اور عالمِ ملکوت سے تعلق کے قابل بناتا ہے۔ یہ وہ روحانیت ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے اور جس کا حصول ہدایت فطری، اتباعِ ولایتِ حق اور سمع، بصر اور فواد کے درست استعمال سے ممکن ہو جاتا ہے۔ سورۂ مجادلہ کی آخری آیت میں اللہ خالص مومن بندوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ: "**اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ**"۔ یہی وہ افراد ہیں جن کے قلوب پر ایمان کو لکھ دیا ہے اور اُس روح کے وسیلہ سے جو خدا سے ہے یا اللہ کی بارگاہ سے عطا ہوتی ہے، ان مومنین کی تائید فرمائی ہے۔ اِس آیت میں لفظ "اَيَّدَهُمْ" پر خصوصی غور فرمائیں **یعنی روح، نفس کی مانند مومن کے وجود کا حصّہ بلکہ اصلِ وجود نہیں ہے، ورنہ لفظ "تائید" کبھی نہ آتا۔** جیسا کہ کہیں بھی وحیٔ الٰہی میں یہ بیان نہیں ملتا کہ ہم نے مومن کی تائید اُس کے نفس کے ذریعہ سے کی۔ لہٰذا روح ایک بالاتر حقیقت ہے جو اللہ سے اِس قدر قربت رکھتی ہے کہ پروردگار اُسے "مِنّیت" کا درجہ عطا کر رہا ہے یعنی "بِرُوْحٍ مِّنْهُ"۔ یہ غیرِ معصوم کے واسطے اللہ کی عنایتوں کا کمال ہے کہ کیونکہ عبدِ مومن نے اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر لیا ہے، اِس وجہ سے اُسے روح کی تائید و امداد حاصل ہو گئی ہے، باذن للہ۔ یعنی اگرچہ روحِ امری مومن کے وجود کا حصہ نہیں ہے مثلِ نفس، بلکہ ایک بالاتر حقیقت ہے جس کا قرب خدا سے اس قدر زیادہ ہے کہ اللہ اسے مِنّیت کا رتبہ عطا کر رہا ہے؛ لیکن بندہ مومن اپنے اخلاص کی وجہ سے اِس قابل ہو گیا ہے کہ اِس روح کی تائید اللہ کے حکم سے اُس کے شاملِ حال ہو جائے اور گویا کہ وہ روح مخلص مومن کے نفس کو اپنے اندر جذب کر لے اور نفس کی شناخت کا وسیلہ بن جائے۔ یعنی نفس روحانی ہو جائے۔

اگر ہم انبیاء کرام کے حوالے سے بھی جائزہ لیں تو وہاں بھی ہمیں تائید کا ہی ذکر ملے گا۔ نبی اولوالعزم حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر۲۵۳ کے اندر فرمانِ الٰہی ہے کہ: **وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ.** ترجمہ: اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور اُن کی تائید کی روح قدس کے وسیلے سے۔ اِس آیت میں بھی لفظ تائید اِس حقیقت کو بخوبی واضح کر رہا ہے کہ روح ایک بالاتر حقیقت ہے جس سے تعلق اور جس کی تائید نفس کو بلندیٔ درجات عطا کرتا ہے۔ کیونکہ اِس آیت میں ذکر ایک اولوالعزم پیغمبر کا ہو رہا ہے لہٰذا روح کا معیار بھی بلندتر ہے یعنی تائید بذریعۂ روح القدس "۔

اِن تمام بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت شک اور ابہام سے بالاتر ہو جانا چاہیے کہ روح ایک بالاتر اور باعظمت مخلوق ہے، جو خدا سے قرب کی اعلیٰ منزلت پر فائز ہے جس میں صفاتِ امری پائی جاتی ہیں نہ کہ اوصافِ خلقی۔ نفسِ انسانی کے لیے یہ موقع فراہم اور میسر ہے کہ وہ روحِ زندگانی کے ساتھ ساتھ روحِ امری اور ملکوتی سے بھی رابطہ اور تعلق پیدا کر لے اور اِس روحِ خصوصی کی

تائید سے استفادہ کرتے ہوئے مادّیت کی قید سے آزاد ہو جائے اور ملکوت کی وسیع و عریض اور پاکیزہ فضا میں پرواز کے قابل ہو سکے۔

روح کی اقسام:

جیسا کہ ہم نے قبلاً عرض کیا تھا کہ نفس کی اقسام نہیں ہیں لیکن یہ اصول روح پر منطبق نہیں ہوتا۔ کتاب تحف العقول میں جنابِ امیر المومنینؑ سے منقول ایک حدیث روح کی مختلف اقسام (جن سے روح کے درجات کا فہم بھی حاصل ہوتا ہے) کو واضح کرتی ہے اور ایک لحاظ سے عوامی تصور کو روح کے قرآنی نظریے سے قریب ہونے میں بھی مدد دیتی ہے اور حقیقتاً بہت جالب اور حسین ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ روح کے متعلق اپنے بیان کا خاتمہ اُس حدیث پر کریں، متنِ حدیث حسبِ ذیل ہے: ''اللہ نے بندوں کو تین طبقات پر پیدا کیا ہے اور اُن کے لیے تین منازل ہیں۔ (۱) اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَۃ وَ (۲) اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَۃِ وَ (۳) السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۔ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْن انبیا اور مرسلین اور غیر مرسلین ہیں۔ اُن میں اللہ نے پانچ ارواح کو قرار دیا ہے۔ روح القدس، روحِ ایمان، روحِ قوت، روحِ شہوت اور روحِ بدن۔ روح القدس کے سبب سے وہ مبعوث ہوئے بطورِ انبیا اور مرسلین، روحِ ایمان کے وسیلے سے اللہ کی بندگی کی بدونِ شرک، روحِ قوت کے ذریعے سے (اللہ کے) دشمنوں سے جنگ کی اور زندگی کو منظّم کیا، روحِ شہوت کے سبب سے طعام و شراب کی لذت اور حلال راہ سے نکاح کا مزہ حاصل کیا اور روحِ بدن کے وسیلے سے حرکت اور جنبش کی۔ یہ گروہ مغفرت یافتہ اور گناہوں سے پاک ہے۔ قرآن نے کہا ہے: وَ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُس (سورۂ بقرہ۔ آیت ۸۷)۔ اور اُن کی ایک جماعت کے بارے میں فرمایا: وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْه. (سورۂ مجادلہ۔ آیت ۲۲)

پھر قرآن نے ذکر کیا اصحابِ میمنہ کا اور وہ مومنانِ حقیقی ہیں اُن میں چار ارواح کو قرار دیا جو کہ حسبِ ذیل ہیں: روحِ ایمان، روحِ قوت، روحِ شہوت اور روحِ بدن۔ بندۂ مومن سے یہ چار ارواح زائل نہیں ہوتیں مگر یہ کہ اُس کو کچھ حالات درپیش ہوں۔ وہ حالات کیا ہیں؟ (حضرت علیؑ نے فرمایا): ''اِن میں سے پہلا وہ جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا: وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا (سورۂ نحل۔ آیت ۷۰)۔ جس کا ترجمہ یوں ہے کہ جب تم (انسانوں) میں سے کوئی بھی بہت بڑھاپے کی عُمر کو پہونچ جاتا ہے تو اِس حالت میں آجاتا ہے کہ (پہلے اتنا کچھ جاننے کے بعد) اب گویا کہ بالکل لاعلم ہے۔ پس یہ تمام ارواح ناقص (defective) ہو جاتی ہیں لیکن وہ بندۂ مومن ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ اِس لیے کہ ایسا اللہ نے کیا ہے اور بندے کو جھکا دینے والی عمر تک لوٹا دیا ہے۔ پس (وہ زمانہ بھی آسکتا ہے کہ) نہ وہ وقتِ نماز کی معرفت رکھتا ہے اور نہ شب میں تہجد اور دن میں روزوں کی استطاعت رکھتا ہے۔ یہ نقص ہے روحِ ایمان میں لیکن انشاء اللہ کسی نقصان اور ضرر کے بغیر اور اِسی طریقے سے روحِ شہوت میں نقص۔ اور اِس بندے میں (فقط) روحِ بدن باقی رہ جاتی ہے جس کے ذریعے سے حرکت کرتا ہے، یہاں تک کہ موت تک پہنچ جائے بحالتِ خیر۔ اور اللہ اِن احوال کا فاعل ہے۔

(اوپر بیان شدہ خالص مومنین کے علاوہ ایمان قبول کرنے والوں کی) دوسری حالت یہ بھی ہے کہ انسان اپنی قوت اور جوانی کے دور میں خطاؤں کا مرتکب ہوا ہو۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب روحِ قوت جوش مارتی ہے اور روحِ شہوت (گناہوں) کو زینت دے کر سامنے لاتی ہے۔ روحِ بدن اُس کی لگام تھام کر ورطۂ خطا (Domain of sin) میں داخل کر دیتی ہے۔ جب وہ خطاؤں کو لمس کرتا ہے تو ایمان سے الگ ہوتا ہے اور ایمان اُس سے جدا ہو جاتا ہے اور اُس وقت تک پلٹ کر نہیں آتا جب تک وہ بندہ توبہ نہ کر لے۔ **اگر اُس نے توبہ کر لی اس حال میں کہ**

ولایتِ حق کی معرفت سے محروم نہ ہوا ہو ، تو اللہ اُس کی توبہ قبول کرلے گا اور اگر اِس حال میں (خدا کی بارگاہ میں) پلٹا کہ وہ "**تارک الولایہ**" تھا تو اللہ اُسے نارِ جہنم میں داخل کردے گا۔

(پھر وہ نفوس ہیں) جو اصحابِ مشئمہ ہیں اور ایسے افراد وہ یہود و نصاریٰ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا: ''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ پیغمبر کی اِس طرح معرفت رکھتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کی اور اِن میں سے ایک فریق حق کو چھپاتا ہے حالانکہ وہ اِس کا علم رکھتے ہیں۔ یہ حق تیرے رب سے ہے پس تم صاحبانِ شک میں سے نہ ہونا۔'' **انہوں نے انکار کیا جس کی معرفت رکھتے تھے**۔ اِس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ابتلا میں ڈالا اور نتیجتاً اُن سے روحِ ایمان سلب ہوگئی اور اُن کے بدنوں میں تین ارواح باقی رہ گئیں۔ روحِ قوت، روحِ شہوت اور روحِ بدن۔ اور پس وہ چوپایوں سے ملحق ہوگئے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: **اولٰئکَ کالانعامِ بل ھم اضلّ** کیونکہ حیوانات بھی روحِ قوت کے ذریعے سے بوجھ اٹھاتے ہیں روحِ شہوت کی وجہ سے اسباب زندگی فراہم کرتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں اور روحِ بدن کے وسیلے سے حرکت کرتے ہیں۔

اِن تمام بیانات کی روشنی میں یہ معرفت روشن ہوگئی کہ انسان کا نفس روحِ الٰہی، جس کا تعلق عالَمِ حق وحقیقت سے ہے؛ سے وابستہ ہونے کی صلاحیت کا حامل بنا کر خلق کیا گیا ہے اور جیسے جیسے نفس روح کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا چلا جائے گا اتنا ہی عالمِ انوار کی مخلوقات سے مشابہت زیادہ ہوتی جائے گی اور نفس کے لئے ایسے درجہ ومقام کا حصول بھی ممکن ہے جہاں تک رسائی کے بعد وہ نورانی عوالم کی مخلوقات سے بھی زیادہ نورانی ہوجائے کیونکہ اُس نے جسمانیات کی مزاحمت کو عبور کرتے ہوئے روحِ ملکوتی وامری سے اپنے تعلق کو قائم کیا ہے۔

خلاصہ اور اُصولہائے کُلّیہ

CONCLUSIONS

۱۔ ہر شئے کے وجود کی ایک حقیقت ہے جو اُس کا ''نفس'' کہلاتی ہے۔ اگرچہ تمام اشیاء بشمولِ حیوانات نفس رکھتے ہیں لیکن ہماری گفتگو کا محور نفسِ انسانی یا انسانی وجود کی حقیقت ہے۔

۲۔ نفسِ انسانی کی دو بنیادی خصوصیات ہیں:

☆ یہ نفس مختلف حالتوں میں زندہ رہ سکتا ہے جن میں سے ناپسندیدہ حالت '**امّارۃ بالسّوء**' اور لائق تعریف حالت '**مطمئنّہ**' ہے۔ نفس کی حالت (قرآنی لغت میں **شاکلہ**) اِنسان کی قابلیت اور لیاقت کا معیار اور پیمانہ ہے۔

☆ یہ انسان کی گذرتی ہوئی ''زندگی'' کے تجربات اور تاثرات کو محفوظ رکھتا ہے جو ایمان، فکر اور اعمال کے ذریعہ سے وجود میں آتے ہیں۔ تجربات کو محفوظ رکھنے کا مقام نفس کا مرکز یا قلب ہے

۳۔ کیونکہ حقیقتِ وجودِ انسانی نفس ہے لہذا یہ نفس ہی ہے جو ایک عالَم سے دوسرے عالَم میں منتقل ہوتا ہے اور نفس ہی حساب وکتاب یا ثواب وعذاب کا حامل اور مخاطب ہے۔

۴۔ نفس بذاتِ خود ایک صلاحیت اور استعداد ہے اور فی نفسہ کچھ بھی تخلیق نہیں کرسکتا۔ اسے اپنی قابلیت کو واقعیت میں تبدیل کرنے کے لئے دو معاونین فراہم کئے گئے ہیں:

☆ پہلا مددگار وہ قوت اور توانائی جس کی مدد سے عمل کو انجام دیا جاسکے اور مختلف مقاصد کا حصول ممکن ہوسکے۔ اِس قوت کا نام ''روح'' ہے۔ روح کی موجودگی کا عمومی مطلب وہ توانائی ہے جو حیات کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہونے لئے قوت فراہم کرتی ہے۔ لیکن قرآن نے روح کو ایک خاص معنی میں استعمال فرمایا ہے؛ یعنی وہ حقیقتِ امری وملکوتی جو نفس کو عوالمِ بالا اور بالآخر اللہ سے

ملاقات کا اہل بنا دیتی ہے۔ روحِ ملکوتی سے تعلق نفس کو صاحبِ عقل بنا دیتا ہے، یہ عقل Reasoning power کا دوسرا نام نہیں ہے بلکہ حق و باطل کی فرقان اور راہِ حق میں عزم و محکم ارادہ سے عبارت ہے۔اس کے برعکس جو نفس اپنی اختیاری زندگی میں روحِ الٰہیہ سے تعلق پیدا کرنے کی مہلت کو ضائع اور برباد کر دیتا ہے وہ سقوط اور دائمی بدبختی کا شکار ہو جاتا ہے۔

☆ نفس کا دوسرا مددگار ایک ''قالب'' اور ''پیکر'' ہے جس کا بنیادی فائدہ یہ ہے کہ اس کے وسیلہ سے ایک مزاحمت یعنی Resistance اور Impedance فراہم ہو سکے' تاکہ عمل انجام دیا جائے اور اس کے نتائج ضائع نہ ہوں بلکہ نفس میں محفوظ ہو سکیں۔اِس پیکر کا نام جسم ہے۔ جسم سے وابستہ امور جسمانیات کے زمرہ میں آتے ہیں جن میں اہم ترین شہوت و غضب ہیں۔ جسمانیات کی راہ سے ہی شیاطینِ جن و انس، نفس میں نفوذ کرتے ہیں اور اُن کی دراندازی کو روکنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ نفس روح کی جانب توجہ کو زیادہ کرے یعنی شہوت و غضب کو عقل کے تابع کر دے۔

۵۔نفسِ انسانی خلا میں معلق نہیں ہے بلکہ اُس کے وجود کی ایک بنیاد یا Foundation ہے جسے فطرت کہتے ہیں۔نفس اپنی اساسی خصوصیات کو فطرت سے ہی اخذ کرتا ہے۔اِس فطرت کی کلیدی صفت کمالِ مطلق کی تلاش اور اُس کو حاصل کرنے کی خواہش ہے۔یعنی ایسا کمال جس میں زوال نہ ہو اور ایسی نعمت جس میں فنا نہ ہو۔

۶۔ فطرت اور نفس؛ دونوں کا وجود دائمی اور لافانی ہے اس فرق کے ساتھ کہ فطرت کا بننا یا بگڑنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے جبکہ نفس کے تمام امور کا ذمّہ دار اور مکلّف نفس ہے۔

دو سوالات اور انکے جوابات

سوال ۱۔جسم روح کی وجہ سے متحرک ہوتا ہے یا نفس کی وجہ سے؟

جواب۔جسم کی حرکت اور زندگی روح سے متعلق اور وابستہ ہونے کی وجہ سے ہے۔اگر روح جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لے' تو جسم مردہ یا میّت ہو جائے گا نہ کہ نفس۔مثال ایک مشین یا کمپیوٹر اُس وقت تک بے حرکت رہتا ہے جب تک اُسے توانائی کے منبع سے منسلک نہ کر دیا جائے' تو یہاں پر power بطور روح کام کر رہی ہے۔

نتیجہ۔جسم اور روح کا اتصال (connection) جب ختم ہو جائے تو اِس جسم میں نفس قیام پذیر نہیں رہ سکتا اور اسے لامحالہ کسی دوسرے قالب میں منتقل ہونا پڑے گا۔

توجہ۔یہاں پر روح سے مراد وہ قوت اور Energy ہے جس کی وجہ سے پودا اگتا ہے اور حیوانات اپنی زندگی گزارتے ہیں۔مختصراً روح اُس Energy کا نام ہے جو عالمِ مادّہ میں حیات کے ظہور کا سبب بن رہی ہے۔ہم اُس روح کی بات نہیں کر رہے جس کا تعلق عالمِ امر و ملکوت سے ہے۔

سوال ۲۔اگر زندگی جسم و روح کی وجہ سے ہے تو پھر نفس کہاں ہے اور اُس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب۔نفس درحقیقت آگہی ہے۔نفس یعنی وجودِ شئے کی حقیقت ایک سِر یا راز کی مانند خفی اور پنہاں ہے اور اگرچہ کہ سب کچھ اُسی سے وابستہ ہے اور اُسی کی وجہ سے ہے لیکن اُس کا ادراک انتہائی مشکل ہے اور مادّیت کی حدوں میں رہتے ہوئے تو ناممکن۔ اگر جوہرِ نفس نہ ہو تو جسم و روح باہم متصل نہیں ہو سکتے۔اور جسم و روح کی حرکت درحقیقت نفس کے ہی تمایلات اور توجہات کی بنا پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔شاید نفس کی صفت وجودِ انسان میں ایسے ہی ہے جیسے خدا کی صفت کائنات میں۔**مَنْ عَرَفَه**؛ فرق یہ ہے کہ نفس حاجت مند ہے اور خدا غنی و بے نیاز۔

☆☆☆